ساجد خان کے افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(مجھے روشنی چاہیے اور دائرہ کا اسیر کے تناظر میں)

تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

Enlightenment Through Knowledge

مقالہ نگار:

صائمہ خٹک

نگران:

ڈاکٹر راحیلہ خورشید

شہید بے نظیر بھٹو خواتین یونیورسٹی پشاور

سیشن: 2020-23ء

بسم الله الرحمن الرحيم

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ **صائمہ خٹک** نے اردو مقالہ **"ساجد خان کے افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (مجھے روشنی چاہیے اور دائرہ کا اسیر کے تناظر میں)"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے میں اس کے کام سے مطمئن ہوں اور بیرونی ممتحن نے بھی اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ طالبہ کو ڈگری دینے کی سفارش کی جاتی ہے۔

بیرونی ممتحن: ______________________

پشاور

نگران: ڈاکٹر راحیلہ خورشید ______________________
شعبہ اردو بینظیر بھٹو خواتین یونیورسٹی

تاریخ: ______________

شہید بے نظیر بھٹو خواتین یونیورسٹی پشاور

سیشن: 2020-23ء

فہرست مضامین

پیش لفظ

شکر ہے اس رب کا جس کی نعمتوں کا شمار نہیں اور جس نے اس ناچیز کو اس قابل بنایا کہ وہ علم وادب کے ان درخشاں ستاروں میں سے کسی ایک ستارے کے فن اور فکر کا گہری نظر سے مطالعہ کرے اور پھر ان کے بارے میں کچھ لکھنے کی جسارت کر سکے۔ ایم۔ فل کے کورس ورک مکمل کرنے بعد شہید بے نظیر بھٹو وومن یونی ورسٹی پشاور کے شعبہ اردو نے مجھے تحقیقی مقالہ لکھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس ضمن میں موضوع کا انتخاب سب سے اہم اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے لیکن اُس ذات پاک کا کرم اور اساتذہ کی راہنمائی سے یہ مرحلہ بخوبی انجام پایا اور علم وادب کے ان ستاروں میں سے میں نے ساجد خان کا انتخاب کیا۔ جو فن افسانہ نگاری کے میدان میں ایک معتبر نام ہے۔ مقالے میں ساجد خان کی افسانہ نگاری کے کئی پہلوؤں کا گہری نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور مقالے کو تکمیلی مراحل سے گزرانے کے بعد آج اللہ نے اس قابل بنایا کہ حرف اول بھی لکھ سکوں۔

افسانوں میں کون کون سے متنوع پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان کا اسلوب و موضوعات کیا ہیں۔ ساجد خان کے افسانوی مجموعے "مجھے روشنی چاہیے" اور "دائرے کا اسیر" سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی تحریروں کو بطورِ نمونہ پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے مقالہ ہذا میں ساجد خان کے افسانوں کا فکری و فنی جائزہ لیا ہے اور ساجد خان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے جس طرح ثبوت و دلائل اکٹھے ہوئے ہیں۔ ان کو اس مضمون میں شامل کر دیا ہے۔ بے جا ایجاز و اختصار سے از حد پرہیز کی گئی ہے اور بغیر کسی لگی لپٹی کے بالکل سادہ اور آسان عبارت میں پیش نظر ثبوت و دلائل کی روشنی میں موضوع کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

راقمہ نے مقالے کو مربوط مطالعے میں سہولت کے لیے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں افسانہ نگار کے حالاتِ زندگی کو مختصر قلم بند کیا ہے۔ جس میں مصنف کی پیدائش سے لے کر ان کی زندگی کے ہر ایک جزو کو شاملِ مضمون کیا ہے۔

باب دوم میں مصنف کے افسانوں کا فکری مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور ان کے نت نئے موضوعات کی روشنی میں ان کے افسانوں سے ان موضوعات کو منتخب کیا ہے۔ باب سوم میں ساجد خان کے افسانوں کا فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو ان کے فنی کمالات کے ہر پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ آخری باب میں ساجد خان کی افسانہ نگاری کے فکری و فنی

مطالعے کی روشنی میں بحیثیت افسانہ نگار ان کے مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر راحیلہ بی بی کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ جنھوں نے مقالے کی تکمیل میں کمالِ شفقت سے ہر کام میں میری رہنمائی فرمائی، بڑی باریک بینی سے مقالے کی تکمیل میں میرا ساتھ دیا۔ جس کے لیے میں ان کی از حد شکر گزار ہوں۔

علاوہ ازیں دیگر اساتذہ کرام کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھوں گی جنھوں نے مقالے کی تسوید و تفویض میں میری رہنمائی فرمائی۔

ساجد خان اور ان کے اہلِ خانہ کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے اس مشکل کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کی اور دستاویزات اور رسائل و جرائد فراہم کیے۔

اپنے اس تحقیقی کام کے سلسلے میں اپنی دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں اور ساتھ ساتھ اپنے والدین کا بے حد شکریہ ادا کروں گی جن کی دعاؤں کی بدولت میرا مقالہ اپنے اختتام کو پہنچا اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنا کام بآسانی پایہ تکمیل تک پہنچا سکی۔

صائمہ خٹک

اسکالر۔ ایم فل (اُردو)

شہید بے نظیر بھٹو وومن یونی ورسٹی پشاور

باب اول:

ساجد خان کی سوانح شخصیت

ساجد خان کے سوانحی کوائف کو ہم اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں کہ حویلیاں ایک طرف تو سرسبز و شاداب اور زرخیز علاقہ ہے جب کہ دوسری جانب علم وادب کا گہوارہ بھی ہے۔ خصوصاً ہزارہ ریجن، علمی شخصیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ شاعری کے حوالے سے حویلیاں میں بہت سی شخصیات جانی پہچانی ہیں۔ مگر اس کے مد مقابل نثر نگار بھی مکمل طور پر معاشرے کی بھرپور عکاسی کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے ایک اہم نام ساجد خان کا بھی ہے۔ ذیل میں انکی شخصیت و فن کے چیدہ چیدہ نکات بیان کیے جا رہے ہیں۔

1۔ خاندانی پس منظر:

کسی بھی شاعر یا نثر نگار کی شخصیت کی پہچان ان کے خاندان اور آباؤ اجداد سے بخوبی کی جا سکتی ہے۔ ساجد خان کے پر دادا شاہزمان خان کیالہ کی معروف شخصیات میں شمار کیئے جاتے تھے۔ جبکہ انکے دادا میر محمد خان گاؤں "کیالہ" سے حویلیاں آ گئے تھے۔ میر محمد خان حویلیاں کے نامور تاجر تھے۔ جبکہ میر محمد خان کا چھوٹا بھائی سیٹھ میانداد خان المعروف سیٹھ بابا کوئٹہ شہر کواری روڈ بلوچستان میں بڑے ڈھیری فارم کے ذاتی کاروبار سے وابستہ تھے۔ میر محمد خان کا سب سے چھوٹا بھائی خانباز خان قبل از قیام پاکستان کراچی میں رہائش پزیر رہے تھے۔ جبکہ ایک بھائی گاؤں کیالہ میں مستقل سکونت اختیار کیئے رہا تا کہ گاؤں کی غمی شادی کو سنبھالا دے سکے۔ شاہزمان خان سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے جبکہ چاروں بیٹے اپنے اپنے کاموں سے وابستہ رہے۔ گاؤں والے بھائی مصری خان کیالوی کے ذمہ تمام زمینیں جو مختلف گاؤں میں موجود تھیں کیساتھ ساتھ مال مویشی کی ذمہ داری تھی۔۔۔ تمام بھائیوں کے پاس کام کاج کرنے والے افراد بھی موجود تھے۔ میر محمد خان پڑھے لکھے تھے۔ انھوں نے کوٹ نجیب اللہ ہاسٹل میں رہ کر بھی تعلیم حاصل کی تھی۔۔۔ سرکاری ملازمت ملنے کے باوجود انھوں نے ذاتی کاروبار تجارت کو اہمیت دی کیونکہ یہ خاندان سرکاری ملازمت کو غلامی سمجھتا تھا۔۔۔ ساجد خان اس خاندان کا پہلا سرکاری ملازم بھی ہے۔۔۔ اس خاندان کے پچانوے فیصد افراد آج بھی سرکاری نوکری کو پسند نہیں

کرتے۔ میر محمد خان کے بیٹے سخاوت خان نے اپنے والد میر محمد خان کیالوی کے کاروبار کو ہی جاری رکھا گو کہ وہ اس میں بری طرح ناکام بھی ہوئے۔ اسکی وجہ انکی درویش منش اور انتہائی سادہ طبیعت کا عمل دخل بھی ہے۔۔۔۔ مگر ان کے بیٹے ساجد خان نے ایک نیاراستہ اختیار کیا اور علم وادب کے ذریعے اپنا نام ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنادیا س ضمن میں موصوف کا کہنا تھا۔

"میرے دادا میر محمد خان کیالوی حویلیاں کے مشہور و معروف تاجر تھے۔میرے دادا کا کاروبار اپنے وقت کے لحاظ سے وسیع پیمانے پہ پھیلا ہوا تھا انکے کاروبار کو انکا بیٹا سنبھالا نہیں دے سکا۔اسکی وجہ آزاد منش اور سادہ طبیعت تھی کاروبار میں پہ در پہ نقصان ہوتا رہا اور یوں ہر سال کچھ نہ کچھ زمین فروخت کرنی پڑتی رہی"[1]

ایبٹ آباد کی تحصیل حویلیاں کا خوبصورت گاؤں کیالہ سرسبز وشاداب علاقہ ہے۔کیالہ میں ساجد خان کے آباؤاجداد لوئر سلہڑ ایبٹ آباد سے منتقل ہوئے تھے۔گاؤں میں ان کا خاندان پنو خیل نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر انکی تمام رشتہ داریاں معروف قبائل میں موجود ہیں۔۔۔ساجد خان کے پرانے دوست اور ہم جماعت تنویر الٰہی کا کہنا ہے۔

"ساجد خان کے آباؤاجداد قیام پاکستان سے قبل کیالہ سے حویلیاں شہر اور کوئٹہ بلوچستان میں کاروبار کی غرض سے منتقل ہو چکے تھے۔۔۔ساجد خان کی پیدائش حویلیاں بلکہ انکے والد سخاوت خان کی جائے پیدائش بھی حویلیاں ہی ہے۔ساجد خان نے یہاں ہی پڑھا اور سرکاری ملازمت حاصل کی۔انکی مستقل سکونت حویلیاں میں

ہے ان کے آباؤ اجداد عرصہ دراز سے تجارت کرتے آ رہے ہیں

"(2)

ساجد خان کا ذوق وشوق علم وادب کی طرف مائل تھا اسی لئے وہ کئی ملازمتیں ملنے کے باوجود معلمی کے پیشہ سے منسلک ہوئے۔ آج وہ پیشے کے لحاظ سے مدرس اور ذوق کے اعتبار سے نثر نگار جانے جاتے ہیں۔

پیدائش:

ساجد خان کی پیدائش سخاوت خان کے گھر محلہ "ٹینکی" میں ہوئی اس محلے کا نام اب تبدیل ہو کر "محلہ فاروق اعظم" پڑ چکا ہے ۔ یہ حویلیاں کے قدیم محلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جسکی ہر گلی پہ بڑا دروازہ نصب تھا۔ گلی میں داخل ہونے کے لئے ہر دروازے سے گزرنا پڑتا ہے۔ ساجد خان کی پیدائش بھی اسی محلے میں ہوئی۔ اپنی پیدائش اور تاریخ کے متعلق ساجد خان نے بتایا۔

"میری پیدائش محلہ فاروق اعظم (حویلیاں) میں ہوئی سرکاری ریکارڈ میں میری تاریخ پیدائش 15 مارچ 1972ء ہے جبکہ اصل تاریخ 5 مارچ 1971ء ہے۔[3]

سرکاری وغیر سرکاری دستاویزات میں تاریخ پیدائش پہ فاصلہ اس لیے موجود ہے کہ اس وقت بعض والدین اور اساتذہ بچوں کی عمر عموماً کم لکھوایا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ساجد خان کی تاریخ پیدائش میں بھی یہ تفاوت موجود ہے۔

ساجد خان انتہائی لاڈ، پیار، ناز ونعم میں پلے بڑھے۔ ان کے دادا میر محمد خان اور انکی پھوپھیاں ان سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ سخاوت خان سادہ طبیعت کے مالک تھے اس لئے تمام محبتوں کا محور انکا

پہلا بیٹا ساجد خان رہا۔ساجد خان کی والدہ گاؤں کوٹلہ کے ایک بڑے زمیندار گھرانے کی خاتون تھیں ۔انکی دادی بھی کیالہ کے زمیندار خاندان سے تھیں۔دادا اور پھوپھیاں تعلیم یافتہ تھے اس طرح ایک پڑھا لکھا ماحول ان کو میسر آیا۔۔۔پھوپھی مبارک جان نے اپنے بھتیجے کو گود لیا۔وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے مگر گھر کی سربراہ پھوپھو مبارک جان تھیں۔۔۔ان کے دادا میر محمد خان نے اپنی موجودگی میں گھر کے تمام تر اختیارات اپنی بڑی بیٹی مبارک جان کے حوالے کر رکھے تھے۔گھریلو معاملات اور لین دین بھی ان کی پھوپھی ہی کرتی تھیں۔اس ضمن میں ساجد خان نے راقم کو ایک انٹرویو کے دوران بتایا:

"میری پھوپھو کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ شادی کی ناکامی کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی اور مجھے گود لے لیا انھوں نے مجھے انتہائی لاڈ اور بے مثال پیار سے پالا اور اپنا بیٹا بنایا۔ماں کے پیار سے کہیں زیادہ محبت اور توجہ مجھے میری پھوپھی نے دی ۔میں پھوپھو کو ممی کہتا تھا وہ ممی کے نام سے مشہور تھیں۔ محلہ دار قرابت دار انھیں ساجد کی ممی کہہ کر پکارتے تھے میں ستائیس برس تک انکے کمرے میں انکے پاؤں کی جانب ہی سوتا تھا سچ یہ ہے کہ مجھے ماں کی کبھی حاجت ہی نہیں رہی۔ میری سوچوں اور چاہت کی محور میری پھوپھو میری ممی تھیں"(4)

ساجد خان نے اس پیار کی لاج رکھی اور اپنی مرحومہ پھوپھی کے ساتھ وفاداری اور محبت کی لازوال داستان رقم کی۔ ان کی محبت کا یہ اندازہ ان کے ایک افسانوی مجموعہ سے بخوبی ہوتا ہے کہ جس کا انتساب انہوں نے اپنی مرحومہ پھوپھی کے نام کیا۔

"اپنی بہت ہی پیاری پھپھو مرحومہ و مغفورہ مبارک جان کے نام
جنہوں نے میری راہوں کے کانٹے اپنی پلکوں سے چُنے۔"(5)

ساجد خان کا سارا خاندان ایک ساتھ رہتا تھا۔ جن میں والدین, پھوپھیاں شامل تھیں۔ مگر انہوں نے بڑی پھوبھی کے ساتھ اپنی زندگی گزارای۔ علاوہ ازیں ان کی والدہ محترمہ آمنہ بیگم بھی ان سے ازحد پیار کرتی تھیں وہ اپنی والدہ کی طرف بہت کم ہی راغب ہوئے اس سلسلے میں اپنی پھوپھی سے ہی پیار کیا اور انھیں ہی اپنی والدہ سمجھا ۔اس حوالے سے ساجد خان کے دوست اور ماموں خالد خان کوٹلہ نے بتایا۔

"ساجد خان کا بچپن اپنے والدین کیساتھ رہتے ہوئے بھی پھوپھی کے ساتھ گزرا۔ وہ ہر وقت ان کے پلو کو تھامے رکھتے تھے شادی غمی گاؤں جہاں کہیں جاتے ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتے۔ دونوں کا جذبہ محبت بے مثال تھا۔ وہ ایک دن بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ پاتے تھے ان کی پھوپھی ہی انکی ماں تھی وہ اپنی حقیقی والدہ کو امی جبکہ پھوپھو کو ممی کہہ کر پکارتے تھے۔"(6)

خاندانی رشتوں میں سب سے خوبصورت رشتہ بھی پھوپھی کا ہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ساجد خان نے خود اپنی والدہ کی بجائے پھپھو کو اپنی ماں بنالیا اور زندگی کا زیادہ تر حصہ ان کے ساتھ ہی گزار دیا ۔امی کے کمرے میں رہنا امی سے کچھ مانگنا انھیں کبھی بھی پسند نہیں رہا۔ وہ ہر چیز کا تقاضا پھوپھی سے ہی کرتے تھے اور انکا تقاضا پھوپھی ہی پورا بھی کرتی تھیں۔۔

تعلیم وتربیت:

ساجد خان کی تعلیم انتہائی سادہ ماحول میں پروان چڑھی ۔انہوں نے بچپن سے ہی پڑھنا اپنی پھوپھیوں سے سیکھا اور اپنی ذہانت کی وجہ سے قرآن مجید کا ناظرہ محلہ کی باجی محترمہ سارہ کے پاس مکمل کیا ۔ابتدائی حروفِ تہجی محلے کے ہی ایک چھوٹے نجی ادارے میں اپنے پڑوس میں سیکھے۔ سات سال کی عمر میں حویلیاں کے معروف پرائیویٹ ادارے جناح پبلک سکول میں داخل ہوئے۔ جہاں جماعت ہفتم تک رہے۔ جماعت ہشتم میں وہ گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ایک حویلیاں میں داخل ہوئے۔اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق ساجد خان نے ایک انٹرویو میں کیا۔

> "بچپن میں ابتدائی حروف شناسی گھر پہ پھر اردو عربی انگریزی حروف تہجی کی مشق پڑوس کے نجی چھوٹے سے گھریلو ادارے میں کی ،جو حویلیاں کا پہلا نجی ادارہ بھی تھا۔ قرآن کریم کا ناظرہ محلہ کے ایک گھر سے تمام اہلیان محلہ کے بچے بچیوں کیساتھ پڑھا۔اسکے بعد باقاعدہ تعلیم کا آغاز حویلیاں کے جناح پبلک سکول میں داخلے سے کیا اور 1985ء میں ساتویں جماعت امتیازی نمبرات سے جناح پبلک سکول سے پاس کرنے کے بعد آٹھویں تادسویں کے لئے گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 حویلیاں میں داخلہ لیا۔"[7]

ساجد خان نے 1988ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 حویلیاں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ۔اس اسکول میں تین سال گزارنے کے بعد 1990ء میں ایف اے جبکہ 1996ء میں انہوں نے گورنمنٹ ڈگری کالج حویلیاں سے لیٹ ریگولر سٹوڈنٹ گریجویشن مکمل کی۔ اسکے بعد انھوں نے ایلیمنٹری کالج ایبٹ آباد میں داخلہ لیا جہاں انھوں نے الیکشن میں حصہ لیکر صدارت کا انتخاب جیتا اور

چیف پراکٹر اور انچارج بزم ادب منتخب ہوئے۔ ایلیمنٹری کالج وہ ادارہ ثابت ہوا جہاں ساجد خان مختلف علمی وادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگے اور مکمل طور پر ادب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا۔

"ایلیمنٹری کالج ایبٹ آباد میری زندگی میں ایک نیا موڑ لے آیا اور میری طبیعت نے ادب کو نئے زاویوں سے دیکھا اور میں نے افسانوں میں طبع آزمائی کی۔"(8)

امتیازی نمبرات سے کورس مکمل کرنے کے بعد ساجد خان نے یکم نومبر 1996ء میں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں میرٹ پہ ملازمت حاصل کی۔ اسوقت اس کورس میں سب سے زیادہ نمبرات انہی کے تھے۔ ملازمت سے قبل انھوں نے مختلف اخبارات میں کالم لکھنے شروع کر دیئے تھے مزید تعلیم کیلئے انھوں نے پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا۔ ایم اے اردو 2005ء میں ہزارہ یونیورسٹی سے کیا۔ اپنے تعلیمی سفر کے متعلق ساجد خان نے کہا۔

"اگرچہ میرا تعلیمی ریکارڈ کچھ خاص نہیں, کہیں تو بہت اعلیٰ تو کہیں اوسط درجہ پہ کھڑا ہوں اسکی وجہ وہ حالات تھے جن کا میں سامنا کر رہا تھا۔ ہمارے دور کا ایک مسئلہ درست سمت کی نشاندہی کا فقدان بھی تھا۔ ہمیں کسی نے کوئی راستہ ہی نہیں دکھایا خود ہی مضامین کا چناؤ کیا۔ خود ہی صبح شام کام کیا اور اپنے اخراجات پورے کیئے۔ ہم جیسے سب کچھ خود ہی کرتے ہیں۔ جنکو راستے دکھائے گئے انھوں نے ترقی کی جو خوش آئند بات ہے۔ جبکہ ہم جیسے اپنی مدد آپ کے تحت

بہتے چلے گئے اور ساتھ گھریلو اخراجات کیلئے بھی کام کرتے

رہے"(9)

ساجد خان نے مختلف سماجی تعلیمی تنظیموں کی سرپرستی کی جس کا مقصد تعلیم کا فروغ اور معاشرتی ترقی تھی۔ عوامی رابطے اور سوچ کی تبدیلی ان تنظیموں کا مقصد تھا۔

ادب سے دلچسپی کے محرکات:

انسان اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کی خواہش میں مگن رہتا ہے۔ یہ خیالات واحساسات ہر فرد کی فطرت میں شامل ہیں کہ وہ اظہار کیے بنا نہیں رہ سکتا۔ یہ اظہار مختلف انداز سے ہوتا ہے۔ جیسے بول چال، تحریری صورت یا تقریری صورت وغیرہ اس لیے ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ادب اور حیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ادب ہی تفسیر حیات ہے۔ اور تنقید حیات بھی۔

علاوہ ازیں جب کوئی شاعر یا ادیب اظہار کرتا ہے۔ تو اس کا انداز عام افراد سے الگ، بلکہ منفرد ہوتا ہے۔ وہ معاشرے وملک کے حالات وواقعات کو جس انداز سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ کسی دوسرے فرد کے ہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی حوالے سے ساجد خان اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"کوئی بھی تخلیق ہو اس کے پیچھے تخلیق کار کی فنی دریافت، مشاہدے اور تجربے کے بے لاگ تجزیے کا عمل کارفرما ہوتا ہے۔ میں جب اپنے افسانے کا پلاٹ تشکیل دیتا ہوں تو میری کوشش ہوتی ہے۔ کہ اس کا اپنا ایک تاثر بن جائے۔ محض کہانیوں کا تانا بانا بُن دینے سے

تخلیق کا کچا پن اسے اعلیٰ معیار کا فن پارہ نہیں بننے دیتا۔ فوری تاثر کے تحت کہانی لکھی جائے تو اس میں بے شمار جھول رہ جاتے ہیں۔"(10)

جب بھی کوئی تخلیق کار فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اس کے لیے وسیع اور گہرے مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماحول اور اردگرد کے حالات وواقعات کا بغور جائزلیتا ہے پھر اس کو اپنے فن پاروں کا حصہ بناتا ہے۔ یہ حالات وواقعات مختلف موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ جن میں غربت وافلاس وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور معاشی، معاشرتی اور اقتصادی وسماجی مسائل کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اگر چہ کلاسیکی ادب، ادبِ جدید سے الگ کیفیت رکھتا ہے۔ مگر دور حاضر میں جدید ٹیکنالوجی اور مختلف مشینری وآلات کے استعمال نے انسانی زندگی میں افراتفری مچا رکھی ہے۔ ادیب ان تمام تر حالات کو عملی جامہ پہنا کر خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا یہ تمام واقعات خود ادیب کی زندگی پر بھی گزرے ہیں۔ اور وہ بھی ان مسائل سے دوچار ہے۔ اس لیے ساجد خان نے کہا۔

"ہمارے شاعر یا ادیب کو بھی ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جن سے عام آدمی دوچار ہے۔ غربت، مہنگائی، بے انصافی، دھونس، دھاندلی، لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت وغیرہ اسے بھی انہی ناسوروں کا سامنا ہے۔ جب پیٹ میں روٹی نہ ہو تن پر پہننے کے لیے کپڑا نہ ہو، رہنے کو مکان نہ ہو۔ بچوں کی فیس کے پیسے نہ ہوں اور شام ڈھلے یہ ضرورتیں چڑیلیں بن کر ڈرانے لگیں۔ ضروریات تشنہ اور خواہشات دم توڑتی نظر آرہی ہوں تو ادیب کیسا ادب تخلیق

کرلے گا؟ اور اس کے لکھے ہوئے الفاظ کی پذیرائی نہ ہو رہی ہو تو کیا
لکھے گا اور کیسا لکھے گا کس کے لیے لکھے گا۔"[11]

ساجد خان کے اس اقتباس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ ادب ہر دور اور زمانے میں تخلیق ہوتا رہا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ جس کے لیے تخلیق ہو رہا ہے وہ معاشرہ مکمل طور پر تنزلی کا شکار ہو چکا ہے۔ ان کے اندر سے سوچنے سمجھنے کی حِس ختم ہو چکی ہے۔ ضمیر سو گیا ہے۔ اور اپنے ہاتھوں اپنی بربادی خود کیے جا رہے ہیں۔ جن لوگوں اور جس معاشرے کے لیے ادب تخلیق کیا جا رہا ہے، بتایا جا رہا ہے اور سنایا جا رہا ہے وہ مختلف مسائل کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

ساجد خان کی نثر نگاری جس میں افسانہ تخلیق ہوتا ہے۔ یہ افسانہ انہی مسائل کو بیان کرتا ہے۔ جو عصرِ حاضر میں رونما ہو رہے ہیں۔ اس طرح سے ان کا ادب سے دلچسپی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور باقاعدگی سے افسانہ جیسی صنف پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔

ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز:

ساجد خان کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا۔ اپنے سکول کے زمانے میں ہی انہوں نے درسی کتب کے علاوہ مختلف اخبارات ورسائل کا بغور مطالعہ کیا۔ ساتھ ساتھ مختلف ناول اور دیگر تحقیقی کتابیں بھی زیر مطالعہ رہیں۔ ان کا یہ مطالعہ انہیں مضمون نگاری کی طرف لے گیا۔ کالج کے زمانے میں باقاعدگی سے مضمون لکھے۔ ان کی ادبی زندگی کی ابتدا کے متعلق ان کے ایک دوست تنویر الہی نے راقم کو بتایا۔

"ساجد خان زمانہ طالب علمی ہی سے مطالعہ کرتے تھے ان کا ادبی
رجحان الطاف نیوز ایجنسی سے پیدا ہوا۔ کیونکہ حویلیاں میں کوئی

لائبریری موجود نہ تھی ہمارا دوست خورشید انور ریٹائرڈ معلم شام کے وقت الطاف نیوز ایجنسی پہ بیٹھا کرتا تھا۔ ہم شام کو اپنے دوست خورشید انور کے پاس جاتے اور کچھ نہ کچھ پڑھنے لگ جاتے تھے وہیں سے ساجد خان کو لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا انھوں نے ایک ناول لکھا کمپوز کروایا مگر شائع نہیں کروایا۔ ہماری اکثر ملاقات ہر شام کو وہاں ہی ہوا کرتی تھی ہم گھنٹوں وہاں پڑھا کرتے تھے حویلیاں کو پہلی لائبریری ساجد خان نے دی تھی ۔ مگر عوام کی عدم دلچسپی سے لائبریری ختم کرنی پڑی تھی۔"(12)

ایلیمنٹری کالج ایبٹ آباد کے دوران ساجد خان نے کالم نویسی میں طبع آزمائی شروع کر دی تھی ان کی کالم نویسی کی مسلسل مشق ان کے ادبی سفر میں سنگ میل کی حثیت رکھتی ہے ۔چونکہ صاحب مطالعہ شخص ہی ایک اچھا قلمکار بنتا ہے۔ اس بات کی توضیح کرتے ہوئے ان کے ایک دوست راشد خان جدون آف لنگرہ نے بتایا۔

"ساجد خان سے میرا تعلق سکول کے زمانے سے ہے۔ بچپن سے ایک ہی شہر ، ایک ہی سکول اور ایک ہی کالج میں ہم جماعت ہونے کی وجہ سے ساجد خان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے مجھے بخوبی واقفیت ہے۔ عرصہ دراز سے ساجد خان مختلف اخبارات، رسائل اور ادبی محفلوں میں اپنے مضامین اور تحریروں سے لکھنے لکھانے کے شوق کی تکمیل میں کوشاں رہے۔"(13)

ساجد خان نے جن اخبارات میں کالم لکھے، ان میں شمال، شملہ، صبح، ندائے ہزارہ, ندائے خلق, آبشار اور سرحد نیوز وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کالم تین سو سے قدرے اوپر ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کا تعلیمی سفر برقرار رہا۔ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کالم نویسی کے بعد انہوں نے باقاعدہ طور پر افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور درجنوں افسانے تخلیق کیئے۔ اس کے متعلق شاعر اور نثر نگار پرنسپل ملک ناصر داؤد نے کہا کہ:

"ساجد خان درس و تدریس کے ساتھ ساتھ کالم بھی لکھتا رہا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر میرے علم کے مطابق ساجد خان تحصیل حویلیاں کا پہلا صاحب کتاب افسانہ نگار ہے۔ نثر میں اس نے افسانہ نگاری جیسی صنف کو اپنا محور بنایا، اسکے افسانے معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے جبکہ اخبارات کے ادبی صفحات کی بھی زینت بنے۔ اس کے افسانے سو سے قدرے اوپر ہونگے۔ ملکی صوبائی اور علاقائی سطح کے افسانہ کے اوپر تحقیقی کام کی کتب میں بھی اسکا تعارف اور افسانہ شامل ہے جن حضرات نے بھی افسانہ کی تحقیق پہ کام کیا انھوں نے ساجد خان کے افسانوں کو بمع تعارف شامل کیا۔ جو ہمارے علاقہ کے ساتھ ساتھ آئندگان کیلئے خوش آئند ہے۔"(14)

ان کا ادب سے شغف اور دلچسپی نہایت گہری ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں۔ تو سماں بندھ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو افسانوں مجموعے منظر عام پر آئے جن میں "مجھے روشنی چاہیئے" اور دائرے کا اسیر" ادبی دنیا میں نمایاں مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے ادبی آغاز کے متعلق اور تخلیقی وصف کے بارے میں ان کے دوست جنرل سیکرٹری حویلیاں تحصیل بار ایڈووکیٹ مسعود اختر کہتے ہیں:

"ساجد خان بطور کالم نویس ایلیمنٹری کالج ایبٹ آباد سے سامنے آئے تھے۔ 1994ء سے بطور کالم نویس اخبارات میں لکھتے رہے۔ وہ کالج کے چیف پراکٹر اور انچارج بزم ادب تھے ۔پھر ان کے دوست انہیں ادب کی جانب لے گئے۔ ان کی پہلی افسانوی کتاب "مجھے روشنی چاہیے۔" تھی ۔جب کہ دوسرا افسانوی مجموعہ "دائرے کا اسیر" ہے ۔ان کے مزید افسانے بھی ہیں جو کتابی صورت میں ابھی سامنے نہیں آئے ۔ساجد خان ایک سماجی ورکر ہونے کیساتھ ادبی میدان کا بھی شاہسوار ہے۔ جس نے مسلسل محنت شاقہ سے یہ مقام حاصل کیا ہے ۔وہ حویلیاں کا ادب کے میدان میں پہلا صاحب کتاب مصنف ہے۔ جو ہمارے لئے بھی کسی اعزاز سے کم نہیں۔ حویلیاں جہاں ادبی بیٹھک میں گنے چنے چند افراد شرکت کرتے ہیں وہاں انکی پہلی کتاب مجھے روشنی چاہیئے کی تین تقریبات کا منعقد ہونا اور پہلی ہی تقریب میں سینکڑوں افراد کا شرکت کرنا اور کتاب خریدنا کسی اعزاز سے کم نہیں"(15)

ساجد خان کی ابتدا بطور مضمون نگار سے ہوئی ۔انکی طلباء کیلیئے لکھی تقریریں ضلعی اور صوبائی سطح پہ انعامات سمیٹتی رہیں۔ وہ خود بھی حویلیاں کے بہترین مقررین میں شامل ہیں۔ جو ضلع کی سطح پہ کئی ایوارڈز لے چکے ہیں۔ انھوں نے کئی کالم اور افسانے تخلیق کیے اور پھر مکمل طور پر دو اہم افسانوی مجموعے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں شامل کیئے۔۔۔

ملازمت:

1996ء میں ساجد خان نے گورنمنٹ ڈگری کالج حویلیاں سے گریجویشن مکمل کی اور اسی سال معلمی کا پیشہ اختیار کیا اپنی ملازمت کے آغاز کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

"ابتدا ہی سے میرا شوق پڑھنے پڑھانے سے رہا ہے مجھے کئی سرکاری محکموں میں ابتدائی ٹیسٹ کے بعد منتخب کر لیا گیا مگر 1996ء میں بی اے پاس کرنے کے ساتھ ہی میں نے بطور مدرس ملازمت اختیار کی۔"(16)

اس ملازمت کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ہزارہ ڈویژن میں مجموعی طور پر تیسری پوزیشن حاصل کی، جبکہ ضلع ایبٹ آباد میں وہ اول نمبر پہ تھے۔ ملازمت کے دوران ساجد خان کی تعیناتی مختلف سکولوں میں ہوتی رہی وہ آج حویلیاں کے ایک نامور تاریخی سکول گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اسی حوالے سے انہوں نے بتایا:

"اپنی ملازمت کے دوران میں مختلف سکولوں میں بحیثیت معلم درس وتدریس سے وابستہ رہا، میں آج گورنمنٹ ہائی سکول حویلیاں نمبر 1 میں معلمی کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں، میں نے خود بھی تین برس اسی ادارے میں پڑھا۔ میں آٹھویں بی میں داخل ہوا تھا اور آج آٹھویں بی ہی کا انچارج بھی ہوں"(17)

ساجد خان ملازمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جبکہ افسانہ نگاری کو اپنی عبادت گردانتے ہیں۔ درس وتدریس کے دوران وہ اپنے تمام کاموں کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے تدریسی افعال سرانجام دیتے

ہیں۔ فراغت کے وقت قلم اٹھاتے ہیں۔ اور ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ایک دوست مفتی حفیظ الرحمٰن طاہر نے کہا:

"ساجد خان کی ملازمت ہو یا افسانہ نگاری، دونوں راہوں پر وہ مسلسل آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ معلمی کے دوران وہ طلبہ کے اندر مثبت سرگرمیاں بروئے کار لاتے ہیں۔ اور ان کی تعلیم اور مستقبل کو روغن کرنے کے کوشاں رہتے ہیں۔ اگرچہ آپ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ مگر اس کے لیے انہوں نے مخصوص وقت مقرر کیا ہے۔ جس کے دوران آپ تخلیقی کام کرتے ہیں۔"(18)

ساجد خان تعلیمی میدان میں بڑھ چڑھ کر طلبا کے اندر شعور وادب کی پرتیں وا کرتے ہیں۔ اپنی تمام تر قوتیں اور صلاحیتیں طالب میں منتقل کرنے کے متمنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کامیابیاں و کامرانیاں سمیٹتے ہوئے اپنا فریضہ بطریق احسن نبھا رہے ہیں۔

خانگی زندگی:

ساجد خان کا تعلق ایک باوقار خاندان سے ہے یہ خاندان سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے مکمل ہے اسی خاندان سے نسبت کی بدولت ساجد خان کی خانگی اور ذاتی زندگی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس حوالے سے ان کے بچپن کے دوست تنویر الٰہی نے کہا:

"اگرچہ ساجد خان کا تعلق ایک اچھے خاندان سے ہے جو مناسب زندگی بسر کر رہا ہے، مگر ساجد خان نے معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کیلئے ہمیشہ ہر فورم پہ آواز بلند کی ہے۔ ان کی آواز کو سنا جاتا ہے

اور وہ اپنی آواز سنانے کے فن سے بھی آشنا ہیں۔ ایم این ایز، ایم پی ایز، ضلعی ممبران اور لوکل گورنمنٹ کے عہدیداران انکی رائے کو مقدم جانتے ہیں۔ انھوں نے گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول کیلئے خطیر رقم ضلع نائب ناظم ایبٹ آباد سے حاصل کی۔ اسی سکول کے روڈ کیلئے لوکل گورنمنٹ سے لاکھوں روپے خرچ کروائے ۔تمام راستوں کو پختہ کروایا، اپنے شہر اور محلہ کیلئے بھی انکی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ وہ حویلیاں میں ایک قلمکار کی ساتھ ساتھ سماجی کارکن کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں"(19)

ساجد خان اپنے دوستوں اور دیگر افراد کے ساتھ ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کا ادب واحترام ان کا بنیادی وصف ہے۔ تمام اوصاف میں ان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ درگزر کرنا اور معاف کرنا جانتے ہیں۔۔

ساجد خان کی ذاتی زندگی میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے تین شادیاں کی ہیں۔ 1998ء میں پہلی شادی ہوئی ۔اس شادی سے انکی کئی اولادیں اللہ پاک کی رضا ہو گئیں۔ جبکہ دو بیٹیاں مریم نور اور سلمی نور عطا ہوئیں ۔مجھے روشنی چاہیئے کہ اقتباس میں دونوں بیٹیوں کا ذکر موجود ہے دوسری شادی مارچ 2011ء میں جبکہ تیسری شادی نومبر 2015ء میں ہوئی۔۔۔وہ اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ:

"میری پہلی شادی 1998ء کو ارجمند بی بی سے ہوئی ۔اللہ نے دو بیٹیوں کی نعمت سے نوازا ان بیٹیوں میں مریم نور اور سلمیٰ نور ہیں ۔دوسری شادی 2011ء میں گل بی بی سے ہوئی اور ایک بیٹا عثمان

خان عطا ہوا جو زیر تعلیم ہے اور قرآن پاک حفظ کر رہا ہے۔ تیسری شادی 2015ء میں شازیہ سے ہوئی۔ مگر 2016ء میں اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔"[20]

ساجد خان بڑوں کے ساتھ بڑے اور چھوٹوں کے ساتھ چھوٹے ہیں اسی وجہ سے انکے طلباء انھیں بہت پسند کرتے ہیں اور محبت اور احترام کا رشتہ رکھتے ہیں۔ ساجد خان دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار ہیں۔ وہ دوسروں کی غلطیاں بیان کرنے کے بجائے ہمیشہ پردہ پوشی، خاموشی اور معافی کا درس دیتے ہیں انکے دوست ہر غمی شادی میں مشکل آسان وقت میں ان کے ساتھ کھڑے رہے، انکی دوسری کتاب دائرے کا اسیر کا اقتباس دوستوں کی محبت کے نام ہے ۔

مجلسی زندگی:

خانگی زندگی کی طرح ساجد خان کی مجلسی زندگی بھی نمایاں مقام رکھتی ہے۔ چونکہ آپ ابتداہی سے مختلف عملی وادبی سرگرمیوں سے وابستہ رہے۔ ان سرگرمیوں میں حویلیاں کی ایک ادبی تنظیم "قلم کارواں" سے منسلک رہے۔ پھر انہوں نے "حرف اکادمی ہزارہ" کی بنیاد اپنے دوستوں سے باہمی مشاورت کی بنا پر رکھی، جن میں محسن چوہان، پروفیسر فرحان انجم، آغا جعفر محمود ہاشمی، پروفیسر خورشید احمد عون, بدر منیر, عامر شہزاد, ڈاکٹر کاشف شاہد بٹ اور پروفیسر ملک ناصر داؤد سر فہرست ہیں۔ اس تنظیم کے متعلق ساجد خان کہتے ہیں:۔

"حرف اکادمی پاکستان اگرچہ پہلے سے موجود تھی مگر ہزارہ میں اس کا آغاز ہم چند لوگوں نے مل کر لیا۔ ابتدا میں اس تنظیم میں بہت کم لوگ تھے مگر اب رفتہ فتہ تعداد بڑھ کر 25 تک جا پہنچی ہے۔"[21]

ساجد خان کی مجلسی وادبی زندگی اس لیے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ جہاں وہ ادب تخلیق کرکے عوام کے مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ وہاں ساتھ ساتھ طلباء کی ہم نصابی سرگرمیوں، تقریری مقابلوں اور مضامین کے ذریعے ان میں مثبت اقدامات کرتے نظر آتے ہیں۔ ساجد خان نہ صرف ایک افسانہ نگار ہیں بلکہ معاشی و معاشرتی مسائل تک رسائی حاصل کرکے عوام کو اس سے آگاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔اس حوالے سے محمد بشیر رانجھا یوں رقم طراز ہیں۔:

> "ساجد خان چونکہ افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا شعری ذوق بھی رکھتا ہے اور اس ذوق کی تسکین کے لیے وہ اکثر شعرا کی محافل میں نظر آتا ہے۔ یوں اس کی تحریروں میں "قلم کارواں حویلیاں" کے شعرا کی دوستی اور حرف اکادمی ہزارہ کے ساتھ نشت وبرخاست کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔"[22]

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ساجد خان کی مجلس زندگی محدود نہیں بلکہ وہ ہر لحاظ سے اپنا ادبی ذوقِ تسکین مکمل کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ انکے ایک دوست ملک عرفان حویلیاں گاؤں انکی مجلسی زندگی کے متعلق کہتے ہیں۔:

> "اگرچہ ساجد خان ایک افسانہ نویس ہے مگر محفل مشاعرہ ہو یا کوئی ادبی سرگرمی ساجد خان اس میں شمولیت ضروری سمجھتا تھا وہ کئی برس صرف انہی کاموں میں مشغول رہا مگر اب اسکی یہ مصروفیات کسی حد تک کم ہو چکی ہیں۔"[23]

ساجد خان افسانہ نگاری کے حوالے سے اس لیے بھی زیادہ مشہور و معروف ہیں کہ وہ چھوٹی بڑی تمام ادبی تنظیموں مشاعروں اور ادبی حلقوں سے وابستہ ہیں۔ مختلف اخبارات رسائل و جرائد اور کالم نویسی کے حوالے سے بھی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ اس لیے اس بات کا تذکرہ بھی ضروری تھا کہ دیگر شعرا و ادباء سے ساجد خان کی ادبی و مجلسی زندگی الگ اور منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

سماجی سرگرمیاں:

ساجد خان کی سوانح حیات میں دیگر عناصر کی طرح سماجی سرگرمیاں بھی اہم مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔ آپ مختلف ادبی و غیر ادبی اور سماجی انجمنوں کے اہم رکن اور سربراہ رہ چکے ہیں۔ ایک سماجی تنظیم جو محلہ فاروق اعظم میں کئی دہائیاں قبل بنائی گئی تھی "انجمن فلاح و بہود" ساجد خان 22 برسوں سے اس تنظیم کے جنرل سیکٹری کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں اس حوالے سے ان کے ایک دوست محمد زاہد قریشی نے بتایا:

> "ساجد خان اس کمیٹی سے کئی برسوں سے وابستہ ہیں اگر محلے یا کمیٹی کے افراد میں کوئی غم یا خوشی ہوتی ہے تو سارے کا سارا نظام ساجد خان اور ان کے دوستوں کے پاس ہی ہوتا ہے اہلیان محلہ کو ان پر پورا یقین ہے کیونکہ وہ اپنا کام پوری ایمانداری سے کرتے ہیں۔
> (24)"

آپ سماجی سرگرمیوں کے حوالے سے اس لیے پہچانے جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے سماج میں رہنے والے تمام افراد کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ آپ سماجی کارکن ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ہمیشہ خوش مزاجی و خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ اس لیے معاشرے کا ہر فرد آپ کو عزت واحترام

کی نگاہ سے دیکھتا ہے اسی حوالے سے ساجد خان کے ایک دوست چیئرمین صباحت خان جدون کہتے ہیں
:

> "ساجد خان تعلیمی اور تحریری سلسلہ کے علاوہ ایک اچھے سماجی ورکر بھی ہیں۔ محلے اور علاقے بھر میں عوام کے ساتھ خوشی اور غم کے تمام واقعات پر مقدم نظر آتے ہیں۔ اور ہر آدمی کے دکھ دور میں بھرپور شریک ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عوام الناس بھی ان کی شخصیت سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی ترویج کے لیے مختلف محاذوں پر سرگرم عمل رہتے ہیں۔"(25)

ساجد خان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ جہاں وہ تعلیمی وادبی میدان میں پیش پیش ہیں۔ وہاں ساتھ ساتھ مختلف سماجی تنظیموں کی فلاح وبہود کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان تنظیموں میں "فرض سٹیزن کمیونٹی بورڈ حویلیاں" شامل ہے۔ علامہ مشرق فاؤنڈیشن ایبٹ آباد کے جنرل سیکرٹری رہ چکے ہیں جبکہ "حرف اکادمی ہزارہ" کے سابق کوآرڈینیٹر اور کاوش فاؤنڈیشن ایبٹ آباد" کے ایگزیکٹو ممبر رہے۔ اور بطور سماجی ورکر اپنے افعال سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ان کے سماجی افعال کو معروف افسانہ نویس ڈاکٹر پروفیسر عادل سعید قریشی ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

> "ساجد خان ایک سوشل اکٹیوسٹ ہے۔ شروع ہی سے ان کے اندر معاشرے کا خدمت گار بننے اور ایک سماجی کارکن بننے کا شوق یا لگن موجود تھی۔ اس میں انہوں نے نیک نام کمایا ہے۔ اپنے گاؤں اور شہر میں ایک ہمدرد سماجی کارکن کے طور پر جانا جاتا ہے۔ جسے نے

ایک بڑے معاشرے کا خواب ہی نہیں دیکھا بلکہ اس کے لیے کوشش بھی کی ہے۔ اور آج بھی ان سماجی سرگرمیوں میں اپنے تخلیقی کاموں کا وقت خرچ کر دیا ہے۔ اور وہ وقت کے اس مصرف کو اپنی بہترین انویسمنٹ جانتا ہے۔"(26)

ساجد خان نے اپنے سماج کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ان تھک محنت کی ہے۔ جس کے صلے میں مختلف انجمنوں نے ان کے ادبی و سماجی افعال کو سراہا اور ایوارڈ و اعزازات سے بھی نوازا۔ جن میں سے چند اک درج ذیل ہیں۔

1. صدائے پھلگراں (مجھے روشنی چاہیے)
2. حویلیاں پریس کلب (مجھے روشنی چاہیے)
3. پریس کلب کلر کہار برائے ادبی خدمات (دائرے کا اسیر)
4. سادات ایکٹوِیٹیزن کمیونٹی (دائرے کا اسیر)
5. علامہ مشرقی ایواڈ برائے حسن کارکردگی ادبی خدمات
6. بیسٹ ٹیچر ایوارڈ برائے حسن کارکردگی ادبی خدمات
7. اے اینڈ ایس ہیلتھ آرگنائزیشن ایبٹ آباد ٹیلنٹ سپر ہیرو ایوارڈ گولڈ میڈل۔

مندرجہ بالا تمام اعزازات کے صلے میں سماج اور اس سے جڑا ہر فرد آپ کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ اور آپ کے تمام عملی اقدامات اور سماجی سرگرمیوں کو سراہنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اپنے دل میں ان کی محبت اور عزت و احترام کو بسا لیتے ہیں َ

شخصی خدوخال:

کسی بھی ادیب یا شاعر کے شخصی خدوخال زبان وادب پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اگر کسی شاعر یا ادیب کی شخصیت کو پرکھنا ہو تو اس کے فن پاروں سے ان کے حالات وآثار نمایاں جھلک رہے ہوتے ہیں یہی شخصی خدوخال ادب کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اس لیے امر اس بات کا ہے کہ اگر کسی شخصیت کے ادب پاروں میں موضوعات کا فکری فنی مطالعہ کیا جائے، تو وہاں اس کے شخصی خدوخال کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی اور واقفیت بھی ضروری ہوتی ہے۔

ساجد خان کے شخصی خدوخال میں بہت سے ایسے خصائص شامل ہیں جو دوسرے افراد سے منفرد ہیں۔ ان خصوصیات میں سب سے پہلی اور بنیادی خوبی انکی خوش مزاج اور صاف و شفاف طبیعت ہے ان کی طبیعت کے متعلق اور سیرت و شخصیت کے بارے میں شاعر خداداد خالد لکھتے ہیں۔:

> "ساجد خان کی شخصیت آئینہ کی طرح شفاف اور واضح ہے ہماری اکثر نشت و برخاست تسلسل کیساتھ رہی۔ وہ بے باک خوش مزاج شخصیت کے مالک ہیں ،انکی اگر کسی غلطی کی نشاندہی کی جائے تو بجائے دلائل دینے کے اپنی غلطی ماننے میں ذرہ بھر تامل نہیں کرتے۔"(27)

ساجد خان کی ظاہری شکل وصورت اور قدو قامت معاشرے کے عام انسانوں کی طرح ہے مگر طبیعیت میں نرم مزاجی، شفقت، ہمدردی اور خوش مزاجی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔۔

ساجد خان اپنے کام میں مخلص اور ہمدرانہ رویہ اختیار کرتے ہیں ۔اس حوالے سے ان کے ہم پیشہ دیرینہ دوست معلم گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 ملک محمد ساجد اعوان کہتے ہیں۔:

"ساجد خان اپنے کام سے مخلص ہیں، طلباء کے ساتھ ان کا رشتہ مضبوط ہے اسی لئے طلباء ان سے محبت کرتے ہیں۔ وہ نصابی سرگرمیوں کیساتھ ہم نصابی سرگرمیوں میں طلباء کی مدد کرتے ہیں اردو سے محبت کی وجہ سے ساجد خان طلباء کے تلفظ اور الفاظ کی ادائیگی پہ بہت زور دیتے ہیں۔۔"(28)

ساجد خان سے کئی افراد دور دراز کے شہروں سے خصوصی طور پہ ملنے بھی آتے ہیں۔ وہ جس سے ملے دوستی اور تعلقات گہرے ہوگئے۔ ان کا حلقہ احباب کافی وسیع ہے طبیعت میں وسعت ہے وہ کھلے ذہن سے تجزیہ کرتے اور اپنے تجربات کو دوستوں سے شیئر کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں ۔اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور کسی نئی بات یا موضوع کے سامنے آنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اس حوالے سے ان کے ہم پیشہ دوست معروف نعت خواں مفتی حفیظ الرحمن طاہر کا کہنا ہے:

"ساجد خان ایک اچھے معلم ہیں۔جو انتہائی باذوق اور دلچسپ طبیعت کے مالک ہیں ہر وقت نئی چیزوں کو سمجھنے سمجھانے اور سیکھنے سکھانے میں مصروف رہتے ہیں۔ کوئی بھی نیا عنوان ان کے سامنے زیر بحث لایا جائے تو وہ اس پر خوشی محسوس کرتے ہیں اور اگر کسی غلطی پر متنبہ کیا جائے تو اسے بھی تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ۔وہ ایم اے اردو کیساتھ ساتھ ایم اے اسلامک سٹڈیز بھی ہیں ۔اس سلسلے میں اکثر دینی مسائل کی تفہیم کے سلسلے میں بحث و مباحثہ اور گفتگو جاری رہتی ہے۔ وہ راسخ العقیدہ شخصیت, توکل علی اللہ پہ کامل یقین اور پختہ ایمان رکھنے والے دوست ہیں۔"(29)

ساجد خان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی طبیعت میں حساسیت کا عنصر بہت زیادہ ہے وہ صبر اور برداشت کرنے والی شخصیت ہیں مگر وہ ایک انسان ہیں پتھر نہیں۔ وہ معاشرے میں ہونے والے ظلم و جبر زیادتی دیکھتے ہیں تو جذبات کی شدت میں بعض اوقات گالیوں اور غیر مہذب باتوں پر بھی اتر آتے ہیں۔ مگر جلد ہی اپنی غلطی اور بری باتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ جس معاشرے میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم ہو، ظلم و جبر ہو، جاگیر دارانہ نظام ہو اور معاشی استحصال جیسے عناصر جنم لے لیں۔ تو وہاں ایک شخص کیا، معاشرے کے تمام افراد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حق کی آواز لگاتے ہیں۔ مگر اس آواز کا اندازہ ساجد خان کے ہاں کچھ الگ اور منفرد نظر آتا ہے۔

ساجد خان آزاد منش شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ذہنی روحانی اور جسمانی غلام نہیں بلکہ اپنی راہیں خود تلاش کرتے ہیں وہ کسی کا سہارا نہیں لیتے اپنا کام خود کرنا بہتر جانتے ہیں۔ وہ خود اعتماد شخص ہیں جو دوسروں پر بھی جلد اعتماد اور بھروسہ کر لیتے ہیں۔ اس ضمن میں افسانہ نگار اور شاعر محمد بشیر رانجھا یوں رقم طراز ہیں۔

> "آزادی ساجد خان کے وجود کا سب سے بڑا مسئلہ ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ آزادی سرمائے سے سلب ہوتی ہے اور اس کے ذریعے انسانوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے اس لیے وہ آزاد ہے۔"(30)

ساجد خان اعلیٰ تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ علمی وادبی لحاظ سے ایک معتبر حوالہ ہیں۔ اس کے پس منظر میں ان کا خاندان جن میں پھوپھیاں، والدین اور ان کی اپنی محنت کا عمل دخل ہے۔ آپ خود اعتماد اور خودداری کے ساتھ جینے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ اسی بات کے پیش نظر وہ اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور زبان وادب میں تخلیقات پر اپنی شخصیت کا عکس ڈالتے ہیں۔

تصانیف پر تبصرہ:

ساجد خان نہ صرف ایک بہترین افسانہ نگار ہیں۔ بلکہ ایک اچھے معلم اور ادیب بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز بطور مضمون نگار کیا، اس مقصد میں آپ کامیاب رہے مگر دیگر اصناف کی بجائے انہوں نے فن افسانہ نگاری سے آشنائی رکھتے ہوئے ڈھیروں افسانے تخلیق کیے۔ اس حوالے سے حویلیاں کی معروف علمی شخصیت مفتی ڈاکٹر قاسم علی الہاشمی کہتے ہیں کہ:

"ساجد خان کی طلباء کیلئے لکھی تقریریں معاشرتی مضامین بچوں کی ذہنی بالیدگی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ انکے کالم مختلف اخبارات کی زینت بنے جبکہ انکی کتابوں پہ لکھی تاثراتی تحریریں اور مضامین الگ سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔ مگر ان کی جو خدمات فن افسانہ نگاری میں ہیں داد و تحسین کی حامل ہیں۔ وہ جب وہ لکھتے ہیں تو خوب لکھتے ہیں ۔وہ معاشی ،معاشرتی، نفسیاتی ،جذباتی مسائل کو افسانے میں پیش کرنے کا ڈھب خوب جانتے ہیں ۔ان کا حویلیاں شہر کی شخصیات کے حوالے سے قسط وار سلسلہ سوشل میڈیا پہ تواتر کیساتھ شائع ہو رہا ہے جس کو پڑھنے والوں کی کثیر تعداد سوشل میڈیا پہ موجود ہے"[(31)]

ساجد خان کے افسانوں کی تعداد کئی درجن ہے مگر ان کے چند منتخب اور اہم افسانوں کے نتیجے میں اب تک دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان مجموعات میں "مجھے روشنی چاہیے" اور دائرے کا اسیر" سر فہرست ہیں۔

مجھے روشنی چاہیے:

ساجد خان کے افسانوی مجموعات میں سب سے پہلا باقاعدہ شعری مجموعہ "مجھے روشنی چاہیے" کی اشاعت ہوئی۔ یہ تصنیف اپریل 2011ء میں فرینڈز پبلشرز راولپنڈی سے شائع ہوئی۔ اس مجموعے کے کل 144 صفحات ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کے پیش لفظ میں مختلف شعرا وادبا کی آرا درج ہیں۔ جن میں محمد بشر رانجھا اس تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "مجھے روشنی چاہیے" ساجد خان کے پچیس افسانوں اور کہانیوں پر مشتمل اس کا اولین مجموعہ ہے۔ ساجد خان ہمارے عہد کا ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو روایت شکن بھی ہے اور روایت ساز بھی۔"[32]

اس کے علاوہ اسلام آباد سے احمد جاوید راولپنڈی سے ڈاکٹر محمد وسیم انجم اور ڈاکٹر روشن آرا راؤ نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر روشن آرا راؤ کہتے ہیں۔

> "راکھ تلے دبی چنگاریوں اور دہکتے کوئلوں کی طرح گردوپیش کے مسائل کہانیوں اور افسانوں کا موضوع بنتے رہتے ہیں۔ آج بھی افسانوی ادب میں ایسے ہی سلگتے مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ "مجھے روشنی چاہیے" معاشرے میں بکھرے اسے ہی مسائل کی روداد ہے۔ شاید اس لیے کہ ہماری معاشرتی زندگی انہی سے تعبیر ہے۔"[33]

مجموعہ "مجھے روشنی چاہیے" کا انتساب "اپنی بہت ہی پیاری پھوپھو مرحومہ ومغفورہ مبارک جان کے نام" اور پیاری بہنوں، مریم اور سلمٰی کے نام" کیا ہے۔ اس مجموعے میں کل چوبیس 24 افسانے ہیں۔

ابتدائیہ کے بعد ساجد خان نے اس کا دیباچہ خود لکھا۔ درحقیقت یہ دیباچہ بھی ایک افسانہ ہی کی صورت میں درج ہے جو نئے لکھنے والوں کے لیے ایک نئی اور انوکھی بات ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانے یہ ہیں:۔

1. جواز (دیباچہ)
2. آخری اڑان
3. آکاش
4. سومی
5. اثاثہ
6. اُس پار
7. انقلاب
8. بیٹی
9. پاگل
10. پانچ کا پینتالیس
11. کتے
12. جب اُن کا جی چاہے گا
13. چھوٹا
14. خدمت خلق
15. خون
16. نیست کا قرض

17. سبکدوشی

18. گھروندا

19. مجھے روشنی چاہیے

20. مٹھائی

21. مسکراہٹ

22. نشانی

23. نیند

24. وبال جان

ساجد خان کے افسانوی مجموعہ پر مختلف شعرا و ادبا نے اپنے اپنے الفاظ میں تاثرات بیان کیئے ۔ جن میں مرحوم منشاء یاد اسلام آباد, محمد حمید شاہد راولپنڈی, چیئرمین ہزارہ چیئر پروفیسر بشیر احمد سوز, قاضی ناصر بختیار خان, اجمل نذیر, پروفیسر فرحان انجم, پروفیسر خورشید احمد عون, ڈاکٹر کاشف شاہد بٹ, محمد اسفر آفاقی, جان عالم مانسہرہ, ہزارہ کے مشہور و معروف اردو اور فارسی کے شاعر پروفیسر محمد زمان مضطر نے اس مجموعے پر ایک طویل نظم رقم کی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہئے
بے نور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے
تا درد شب تار بلا چھائی ہوئی ہے
تاحد نظر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے
اب ہاتھ کو بھی ہاتھ سجائی نہیں دیتا

آنکھوں میں بھی اک دھندسی لہرائی ہوئی
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نور سویر رہے مجھے روشنی چاہیے۔[34]

اس کے علاوہ "مجھے روشنی چاہیے" کی ابتدا میں چند اشعار شامل کیے گئے ہیں۔ ان اشعار میں اجم یوسفی کا ایک شعر درج ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

مجھ سے پوچھتے کیا ہو زندگی کے بارے میں
اجنبی بتائے کیا اجنبی کے بارے میں۔[35]

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے[36]

معاصرین کی آرا:

منشایاد:

ادب انسان اور انسانی مقدر کو سمجھے کا ذریعہ ہے اورانسان کو سمجھنے کا مطلب اُس کی مجبوریوں اور قدروں کو سمجھنا ہے۔ انسان کی بلندیوں، پستیوں، الم ناکیوں، طرب آفرینیوں اور روّیوں سے آگاہی دلانے کے لئے ہی ادب تخلیق کیا جاتا ہے...... ساجد خان نے ان افسانوں میں ادب کی مندرجہ بالا قدروں کو کہیں بھی پامال نہیں ہونے دیا۔ساجد خان کا موضوع ہماری معاشرتی زندگی سے اُبھرتے ہوئے اور سلگتے ہوئے معاشی و معاشرتی مسائل کا حسنِ ادراک ہے۔اِن افسانوں میں انہوں نے اپنے تجربے، مشاہدے اور عمیق مطالعے کی روشنی میں جیتے جاگتے کرداروں کو زندگی کے مختلف رنگوں کی صورت میں اُجاگر کیا ہے۔بعض مراحل پر وہ

اپنے قاری سے روبرو مخاطب ہیں تو بعض واقعات و حادثات کو بلا تبصرہ اور بلا واسطہ جیسا دیکھا ویسا ہی پیش کر دیا ہے۔

ساجد خان بنیادی طور پر کہانی سنانا چاہتے ہیں لیکن کہانی کہنے میں جس ٹریٹمنٹ سے کام لیتے ہیں وہ اسے افسانہ بنا دیتا ہے۔ان کے افسانوں میں ”کہانی“ پر زور ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ کہانیاں روایتی کہانیوں سے مختلف نہیں ہیں۔چیزوں، افراد اور کیفیتوں کو محسوس کرنے کا اِن کا انداز اور روّیہ چونکہ جدید ہے اس لئے ان کے افسانے جدید حسیت کے حامل ہیں۔

ساجد خان کے یہ افسانے اگرچہ بیانیہ انداز میں ہیں مگر یہ بیانہ سپاٹ اور سطحی نہیں بلکہ اس میں تہہ داری اور رمزیت کی چاشنی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔اکثر افسانوں میں فلیش بیک کی تکنیک کو بھی برتا گیا ہے کہ بیانہ کے تسلسل میں کسی طرح رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ان کے ہاں افسانہ، کہانی کی فنی صورت کا نام ہے۔وہ ”اینٹی سٹوری“ کی جدید روش کو نہیں اپناتے اور نہ ہی نئے نئے تکنیکی تجربوں کے شوق میں ان افسانوں کو چیستاں بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس دور میں جنس اور رومان سے بچ کر معیاری افسانہ تخلیق کرنے والوں کے شدید بحران میں ساجد خان ایک خوشگوار جھونکا ہے۔

پروفیسر عادل سعید قریشی

ساجد خان اردو افسانے میں ایک تازہ لب و لہجے اور طرز کا نام ہے۔۔ساجد خان ایک صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں جنکے افسانے کئی لحاظ سے ہم عصر افسانہ نگاروں میں انکو ممتاز کرتے ہیں۔۔انکے افسانوں کا موضوعاتی تنوع، معروضی انداز بیان، ان کا بیانیہ سلیقہ،

زبان و بیان کے بالغ قرینے، افسانے میں نفسیاتی عوامل کی ماہرانہ برت، خوش سلیقہ کردار نگاری، پختہ مکالمہ نگاری، لفظوں سے مصوری اور انسانی فطرت نگاری بالخصوص قابل لحاظ ہیں۔۔انکے افسانوں میں انسان دوستی، معاشرتی کجیاں، انسانی کمزوریاں، دیہات نگاری، ہوس و ایثار، فریب و سادہ لوحی، حرص واستغنا، سازش و خلوص غرض انسانی زندگی کے سبھی سیدھے اور ٹیڑھے زاویوں کے نظارے قاری کو ایک خوشگوار حیرت اور مانوس مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔۔انکے افسانوں کو پڑھ کر میرے دل میں جو سوال پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ساجد خان کے افسانے کیوں اس قدر خوش رنگ اور متاثر کن ہوتے ہیں؟۔دراصل اسلوب کی دلآویزی ادب کی معراج ہے اس لیے فنکار اپنے اسلوب کے لیے ہر گھڑی اور ہر زاویہ سے مصروف عمل رہتا ہے۔۔ساجد خان کے اسلوب میں جو چیز نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ اس کی زبان ہے۔۔اسکے افسانوں کی زبان دو خاص وصف رکھتی ہے اول زبان سلیس ہے اور دوم سادگی اور اثر آفرینی رکھتی ہے۔۔افسانہ غیر علمی زبان کا متقاضی ہوتا ہے۔۔ساجد خان اس حقیقت سے خوب آگاہ ہے اور اس نے اپنے افسانوں میں روزمرہ کے عین مطابق لکھا ہے۔ساجد خان کے الفاظ، جملے، تراکیب سازی اور خوبصورت تلازمے کے ساتھ تکرار حرفی و لفظی قاری کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے۔۔ساجد خان اپنے افسانوں میں فصیح سے فصیح تر اور بلیغ سے بلیغ تر جملے لکھتا جاتا ہے۔۔وہ نپے تلے انداز میں اپنا مدعا بیان کرتا جاتا ہے اور اپنی نثر کو حشوو زائد سے مامون رکھتا ہے۔۔لفظ کو لفظ کے ساتھ یوں بٹھاتا ہے جیسے کوئی ماہر معمار اینٹ پر اینٹ بٹھاتا ہو۔۔ایک ایک جملہ اپنے معمار کی ذہانت، بلاغت، فہیم اور ذی شعور ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

جان عالم: مدیر شعر و سخن مانسہرہ

ساجد خان کا نیا افسانوی مجموعہ "دائرے کا اسیر" شائع ہوا۔ اس کتاب کے افسانے بتا رہے ہیں کہ ساجد خان کا فکری سفر جمود کا شکار نہیں ہوا۔ بلکہ ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ ساجد خان نے معاشری موضوعات کو براہ راست اپنے افسانوں کا موضوع بنانے سے یہ تخلیقی سفر شروع کیا تھا۔ لیکن اس کتاب کے افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ساجد خان اب موضوعات کے بطون میں اترنے لگا ہے۔

پروفیسر فرحان انجم:

مئی 2011 میں ساجد خان کا پہلا افسانوی مجموعہ "مجھے روشنی چاہیئے" فرینڈز پبلشرز راولپنڈی نے شائع کیا جسے قارئین اور ناقدین کی طرف سے خوب پذیرائی ملی۔۔انکا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دائرے کا اسیر'' 2014 میں شائع ہوا جس نے انکے فن کو مزید جلا بخشی۔۔انہوں نے سماجی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، ثقافتی، سیاسی اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سمیت کئی روحانی اور نفسیاتی مسائل پر قلم اٹھایا۔۔ساجد خان 1996 سے مختلف رسائل و جرائد میں لکھتے رہے ہیں۔۔۔انکی کہانیاں اور افسانے پاکستان کے اہم ادبی رسائل، اخبارات کیساتھ بیرون ملک سے بھی میں شائع ہوتے رہے۔۔ہزارہ یونیورسٹی نے افسانہ کی دو کتابوں میں انکے افسانے بمع انکے تعارف شامل کیئے۔۔۔اکادمی ادبیات نے 2011ء کے بہترین افسانوں میں انکا افسانہ اثاثہ کو جگہ دی۔۔مختلف قلمکار حضرات نے افسانوی تاریخی مرتب کرتے ہوئے انکا تعارف اور افسانہ اپنی کتب میں شامل کیا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔۔۔ملک کے نامور افسانہ نگار مرحوم منشاء یاد، ڈاکٹر رشید امجد، محمد حمید شاہد، محمد بشیر رانجھا، جان عالم مانسہرہ، ڈاکٹر محمد کاشف بٹ، پروفیسر عادل سعید قریشی، سید ماجد شاہ، اجمل نذیر، پروفیسر ناصر داؤد، خورشید احمد عون کیساتھ ضلع ایبٹ آباد، ضلع ہریپور، ضلع مانسہرہ کے قلمکاروں نے مضامین قلمبند کیئے۔۔۔ان کا افسانہ "مجھے روشنی چاہیئے" اور دائرے کا اسیر" انکی پہچان بنے جن پہ تنقید نگاروں نے کھل کر کے رائے دی۔۔۔وہ حرف اکادمی ہزارہ پاکستان کے فعال رکن رہے اور آجکل کوارڈینیٹر ہیں۔۔۔ان کا قلم اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔۔۔۔

سید ماجد شاہ (اسلام آباد)

ساجد خان کے پاس جہاں افسانے کی جامعیت کی خوبصورت مثالیں موجود ہیں وہاں دلچسپ آغاز بھی قاری کو فوراً گرفت میں لے لیتا ہے۔۔اس سلسلے میں ایک مثال دیکھیے۔۔افسانہ ''زمین سکڑ رہی ہے'' میں ابتدائی جملے کچھ یوں ہیں۔۔''میں پہاڑی پہ بیٹھا ہوں۔۔نہیں کسی جنگل میں گھوم رہا ہوں۔۔نہیں کسی دریا میں ڈبکیاں لے رہا ہوں۔۔'' ان تین جملوں میں قاری، کردار کی کشمکش میں یوں محو ہو جاتا ہے کہ افسانہ ختم کیے بنا بات بنتی نہیں ہے۔۔ایسے خوبصور ابتدائیوں کے ساتھ ساتھ ساجد خان کے پاس سحر انگیز انجام بھی موجود ہیں جن سے قاری لطف اُٹھا تا ہے۔۔ساجد خان کے ہاں افسانے کا عنوان رسماً نہیں آتا بعض جگہ تو اس سے خوب فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔۔مثلا "مردہ خانہ'' میں بڑی عمر کی استانی ایک نوجوان شاگرد سے شادی کرتی ہے تو لوگ اس کی غیبت کرتے ہیں۔۔غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مردہ خانہ عنوان غیبت کی وجہ سے رکھا گیا کہ ہم غیبت کر کے مردہ تعلق دار کا گوشت نوچتے ہیں۔ اسی افسانے کی نسبت سے ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ جہاں جہاں ساجد خان کے ہاں ناصحانہ انداز بلند آہنگ میں سامنے آتا ہے۔۔وہ ایک دم کمال مہارت اور خوبصورتی سے اسے بدل کر کردار کی خود کلامی بنا دیتا ہے کہ کہانی متاثر نہیں ہوتی۔۔مثال کے طور پر اسی افسانے ''مردہ خانہ'' کے آخری جملے دیکھیں۔۔''ہم دوسروں پر انگلی اٹھانے سے قبل اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے۔۔کسی سے اختلاف ہو جانے کے بعد زمین آسمان کے قلابے ملا کر الزامات کی بوچھاڑ کیوں کرنے لگ جاتے ہیں۔۔اس نے قلم سامنے میز پر رکھا اور سارے صفحات ہوا میں اچھال دیئے''۔ساجد خان کے افسانے سماج کی عمومی قدروں کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔۔وہ پیدا واری رشتوں سے جنم لینے والی کہانیوں کو جس

شدت سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسی کیفیت کو افسانوی بنت میں شامل کرنے کا فن بھی بخوبی جانتا ہے۔۔لسانی شعور اور اپنے فن سے خاص محبت ساجد خان کے افسانوں کو اہم بناتی ہے۔۔ہم عصر حقیقت کو کسی تخلیقی ترتیب میں لانا اورپھر افسانوی قالب مہیا کرنا کوئی آسان بات نہیں اور ساجد خان ان تمام مراحل سے آسانی سے گزرا ہے۔۔

ڈاکٹر محمد کاشف بٹ:

ساجد خان ایک قابل ذکر افسانہ نویس ہیں جن کے افسانے اور کہانیاں پاکستانی معاشرے اور ثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کے افسانے انسانیت کے جوہر سے گونجتے ہیں۔ رشتوں کی پیچیدگیوں، تصوف کے پراسرار دائروں اور خود شناسی کے گہرے سفر کو تلاش کرتی کہانیاں ساجد خان کا تخصص ہیں۔ ساجد خان کا ادبی کینوس عام افراد کی زندگیوں کے درمیان کھلتا ہے۔ وہ عام آدمی کے جوہر، اُس کی انتھک جدوجہد، کمزوریوں اور کارگزاریوں کو موضوع کرتے ہیں۔ جہاں وہ پاکستانی معاشرے کی کثیر جہتی فطرت اور اس کی روایات، اقدار اور رسم و رواج کے اندر موجود موروثی خوبصورتی سے اپنے افسانوں کو رنگین کرتے ہیں۔ وہیں اُن کی کہانی ایک طاقتور آئینہ کا کام بھی کرتی ہے۔ وہ نہ صرف معاشرے میں پھیلی تفریق اور عدم برداشت کو افسانہ کا موضوع بناتے ہیں بلکہ انسانی تجربے کی گہرائیوں اور نتیجے میں رونما ہونے والے ردِ عمل کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ”بے بسی، بے چارگی، درماندگی“ ایک ایسا افسانہ ہے جو دانشوری اور علم کی جانچ کرتا ہے، افسانے میں دقیق مباحثوں کی پیچیدگیوں کو موضوع کیا گیا ہے۔ وسیع علم رکھنے کے باوجود، حاضرینِ مجلس اہم سوالات پہ گفتگو کرتے وقت الجھن اور بے چینی کا شکار رہتے ہیں جیسا کہ ان کی گرفت میں کچھ بھی نہ ہو۔۔ماسوائے بے بسی کے۔ عارضی اور ابدی کی بحث لا ین حل قرار پاتی ہے، جو مایوسی اور

خاموشی کا باعث بنتی ہے۔افسانہ انسانی فہم کی حدود کو تلاش کرتا ہے اور علم کی قدر پر سوال کرتا ہے۔ افسانہ خوب صورت مکالماتی فضا بناتا ہے جس میں بین السطور تلاشِ علم بمقابلہ صداقت اور خود کی دریافت پر تنقید کی گئی ہے۔ مجموعی طور دیکھا جائے تو افسانہ سطحی علم کو للکارتا ہے اور تلاشِ حقیقت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

افسانہ ''مکافاتِ عمل'' کے کردار اور منظرنامہ معاشرتی رویوں کے عکاس ہیں۔ملک وقار کا کردار دو مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ایک صورت تب کی ہے جب اس کے پاس اختیار تھا، معاشرہ میں مستحکم مقام تھا اور ان دونوں کے استعمال کا گر بھی۔اس کردار کی دوسری صورت آٹھ اکتوبر 2005 کے زلزلے کے بعد نظر آتی ہے۔جس میں وہ مجبور بھی ہے اور محتاج بھی۔ملک وقار اپنی پہلی صورت میں جس کردار کا استحصال کرتا ہے دوسرے حصہ میں وہی کردار ملک وقار کا مسیحا بن کے سامنے آتا ہے۔افسانہ درحقیقت معاشرتی دباؤ اور رکاوٹوں کو نمایاں کرتا ہے جن سے تعلقات متاثر ہوتے ہیں۔افسانے کا موضوع محبت کی نوعیت اور ذاتی خوشی پر معاشرتی اصولوں کے اثرات سے متعلق سوال اٹھاتا ہے۔کہانی لوگوں کو درپیش اندرونی کشمکش پر روشنی ڈالتی ہے جب معاشرتی توقعات ان کی ذاتی خواہشات سے ٹکراتی ہیں۔افسانہ معاشرتی تعمیرات کی طرف سے عائد کردہ حدود اور انسانی جذبات اور تعلقات کی حساسیت کو عمدہ انداز میں بیان کرتا ہے۔

''دائرے کا اسیر'' میں ایک غیر حقیقی اور پراسرار ماحول پیش کیا گیا ہے۔جس میں مرکزی کردار حقیقت سے لاتعلق اور تجسس کی لہر کا سامنا کر رہا ہے۔بین السطور وجود کی مختلف شکلوں اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کا موضوع تلاش کیا گیا ہے۔کہانی ایک تاریک موڑ لیتی ہے جب فلم کا مرکزی کردار ایک کتے کی موت اور اس کے نتیجے میں تین انسانوں کی

ہلاکتوں پر مشتمل پریشان کن واقعات کا ایک سلسلہ دریافت کرتا ہے۔ افسانہ رشتوں کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ فریب، جذبات اور غلط فہمیاں کے پرت در پرت اثرات موضوع کیے گئے ہیں۔ اختتام ایک پراسرار موجودگی کے ساتھ ایک نئے کردار کا تعارف کراتا ہے، جو مرکزی کردار کو الجھن اور خوف کی حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ کہانی مؤثر طریقے سے جذبات کو ابھارتی ہے اور انسانی روابط کی نزاکت اور ہمارے اعمال کے نتائج کی عکاسی کرتی ہے۔

حوالہ جات

1. ساجد خان، انٹرویو، حویلیاں (ایبٹ آباد)، یکم جون 2022
2. تنویر الہیٰ، انٹرویو، حویلیاں (ایبٹ آباد)، یکم جون، 2022
3. ساجد خان، انٹرویو، حویلیاں، یکم جون 2022
4. ایضاً
5. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، فرینڈز پبلشرز، راولپنڈی، 6116، ص 1
6. نعیم عرف پپو، انٹرویو، حویلیاں، یکم جون 2022
7. ساجد خان، انٹرویو، حویلیاں، یکم جون 2022
8. ایضاً
9. ایضاً
10. ایضاً
11. ساجد خان، انٹرویو، حویلیاں، یکم جون، 2022
12. تنویر الہیٰ، انٹرویو، حویلیاں، 10 جون 2022
13. راشد خان جدون، انٹرویو، لنگرہ (حویلیاں)، 10 جون 2022
14. ساجد خان، انٹرویو، حویلیاں، 10 جون 2022
15. ملک عرفان، انٹرویو، حویلیاں، 10 جون 2022
16. ساجد خان، انٹرویو، حویلیاں، 10 جون 2022
17. ایضاً
18. نعیم عرف پپو، انٹرویو، حویلیاں، 10 جون 2022

19. تنویر الٰہی، انٹرویو، حویلیاں، 23جون 2022

20. ساجد خان، انٹرویو، حویلیاں، 23جون 2022

21. ایضاً

22. محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، فرینڈز پبلشرز راولپنڈی، 2019، ص 11

23. ساجد خان، انٹرویو، حویلیاں، 23جون، 2022

24. ملک عرفان، انٹرویو، حویلیاں، 23جون 2022

25. محمد زاہد قریشی، انٹرویو، حویلیاں، 23جون 2022

26. پروفیسر، ڈاکٹر، عادل سعید قریشی، انٹرویو، حویلیاں، 23جون 2022

27. محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، ایضاً، ص 29

28. ملک شاہد اعوان، انٹرویو، حویلیاں، 23جون 2022

29. مفتی حفیظ الرحمان، انٹرویو، حویلیاں، 10جولائی 2022

30. محمد بشیر رانجھا، ساجد خان، فکر و فن، ایضاً، ص 11

31. زاہد قریشی، انٹرویو، حویلیاں، 10جولائی، 2022

32. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص 13

33. ایضاً، ص 11

34. محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، ایضاً، ص 7

35. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص 2

36. ایضاً، ص 2

باب دوم:

ساجد خان کے افسانوں کا فکری مطالعہ

اردو زبان وادب میں نثری ادب وشعری ادب کو اولیت حاصل ہے۔ جس کے بغیر زبان وادب کی بنیادیں کھوکھلی اور کمزور ہیں۔ نثری ادب میں افسانوی وغیر افسانوی نثر نے ادب میں نہ صرف وسعت لائی بلکہ اس کی تعمیر وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مصنفین وادباء نے اپنے تاریخی، سیاسی وسماجی حالات کا مطالعہ کر کے اسے نثری قالب میں ڈھالا۔ اسی طرح اس کا دوسرا رُخ شعری ادب وسرمایہ ہے۔ کہ شعراء نے جس وسعتِ نگاہ سے حالات کا جائزہ لیا اسے من وعن مقصدیت کا رنگ دے کر پیش کر دیا۔

اگرچہ نثری ادب کے اولین نمونے مقصدیت وحقیقت نگاری سے عاری ہیں مگر اس کی مقبولیت سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی وجہ سے اردو زبان وادب کی کامیابی وترقی اور نت نئ اصناف کی تخلیقات کا جنم ہوا۔ اسی طرح یہ سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے بڑھتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ فن پاروں میں حقیقت نگاری اور مقصدی واصلاحی رجحانات سما گئے اور اب عہد حاضر میں بیشتر ادباء افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب میں حالات حاضرہ کے ساتھ ساتھ عصری رجحانات اور دیگر فکری تصورات کو تخلیق کر رہے ہیں۔ ان فن پاروں کے جائزے ومطالعے سے اس بات سے واقفیت ہوتی ہے کہ یہ عہد کس طرح تہذیبی وثقافتی، مذہبی وسماجی رسومات اور تاریخی حالات سے گزرا ہے۔

افسانوی ادب میں "افسانہ" وہ صنف تحریر ہے جس کے ذریعے افسانہ نگار اپنے زمانے کے حالات وواقعات کو تمام تر فکری سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ جس کے ذریعے عوام میں شعور کی ایک نئ روح بیدار ہوتی ہے۔ اسی صنف کے موضوعات میں غربت وافلاس، ظلم وجبر، ناانصافی وبے باکی اور دیگر ایسے عنوانات جنم لیتے ہیں جو ایک زندہ معاشرے میں رونما ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ قوموں کے درمیان تنازعات اور غیر اخلاقی رویوں اور طبقاتی کشمکش جیسے عناصر کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔

ہر عہد اور ہر زمانے کے افسانہ نگار نے اپنے عہد کے حالات وواقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر اسے عام وخاص میں مقبول ٹھہرایا اور عہد حاضر کے جدید افسانہ نگاروں نے جو ہزارہ سے تعلق رکھتے ہیں، نے اسی صنف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ اس کی تعمیر وترقی اور اس کے رواج کو بھی عام کیا۔ افسانہ کی ترقی میں ہزارہ کے افسانہ نگار پیش پیش ہیں۔ جن میں ایک اہم نام ساجد خان کا بھی ہے۔ جو افسانہ کے فکری وفنی محاسن سے بخوبی آشنا ہیں۔ جنہوں نے پُرخار راستوں پر چل کر زندگی اور اس کی پرچھائیوں کی بھرپور عکاسی کی، سماجی ومعاشی حالات ومسائل کو نئے زاویوں سے دیکھا اور پرکھا۔ ان کے افسانوں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ذاتی استفادہ کے ساتھ ساتھ غم ذات اور روزگار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ آپ جس عمیق نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں شاید ہی کوئی دوسرا اہم عصر افسانہ نگار دیکھتا ہو۔

ساجد خان کا اسلوب منفرد اور مکمل ہے۔ ان کے افسانوں میں نت نئے موضوعات عمدگی سے برتے گئے ہیں۔ آپ اپنے افسانوں کا مواد تخیل سے نہیں اخذ کرتے بلکہ حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں۔ جس سے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ حالات وواقعات جو بیان کیے جارہے ہیں وہ بھی ان میں برابر کا شریک ہے اور اسی ماحول کا حصہ ہے۔ علاوہ ازیں ساجد خان کی تحریروں میں اقدار وروایات کی عکاسی، جذباتی پہلو، معاشی مسائل، رومانویت، نفسیاتی پہلو، دیہی وشہری زندگی کی عکاسی، سماجی مسائل، تانثیت، سیاسی پہلو اور ادبی پہلو جیسے عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام پہلو روایتی ہیں، مگر افسانہ نگار نے انہیں اس انداز سے پیش کیا ہے کہ روایتی ہوتے ہوئے بھی نت نئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کے افسانوں میں زندگی سے تعلق رکھنے والے عام موضوعات سے واقفیت ہوتی ہے جسے افسانہ نگار نے جزئیات نگاری سے پیش کیا۔ اسی اثنا میں افسانہ کے موضوعاتی تنوع کے اعتبار سے ساجد خان کے افسانوں کا فکری مطالعہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

1۔جذباتی پہلو:

لفظ "جذبہ" کی نسبت سے "جذباتی" ماخوذ ہے۔ جذبہ کے معنی کشش یا کھنچاؤ یا غم و خوشی کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد اُس کیفیت کا نام ہے کہ جس میں انسان فطرتاً کسی شے تک رسائی حاصل نہ ہونے کے صلے میں اُس کا محتاج ہو اور اسے پانے کی تگ ودو میں ہر ممکن کوشش کرے۔ یہ کوشش وکاوش ہی انسان کے فطری میلان میں غم و غصہ یا خوشی کے اظہار کا ذریعہ بنتا ہے۔ جذبہ کے متعلق ڈاکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> "انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے جوش و مسرت، عشق و محبت، درد و رنج، فخر و نازہ حیرت و استعجاب، طیش و غضب وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اسی کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں۔"[1]

جذبہ یا جذباتیت دونوں ایک ہی طرح کی کیفیات کا نام ہے۔ جب ادیب یا شاعر اپنی آنکھوں دیکھے حال کو جن زاویوں سے بیان کرتا ہے اور نتیجتاً سماج پر اس کے اثرات مرتب ہونے کی بجائے وٹس سے مَس نہیں ہوتے تو یہ لکھاری ایک کاص جذبے کے تحت ایسی سطح پر فائز ہو جاتے ہیں جہاں سے اُسے کچھ حاصل ہونے کی آرزو ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں وہ غم و غصہ اور تلخ لب ولہجہ کا استعمال کرتے ہوئے منفی پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام الناس میں مثبت عناصر سے پہچان کراتا ہے۔

ساجد خان بھی ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں یہ بات کثرت سے محسوس ہوتی ہے کہ ان کے ہاں جذبات کی فراوانی ہے۔ وہ جس سماج کے فرد ہیں اس سماج کے ہر مثبت و منفی پہلو سے بخوبی آگاہ وآشنا ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا اسلوب منفرد ہے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ یہی حقیقت پسندی اس قدر عروج پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ جذباتی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ

ہے کہ وہ معاشرے کے منفی پہلوؤں اور منفی سرگرمیوں سے اس قدر دل برداشتہ ہو جاتے ہیں کہ ان میں غم وغصے کی لہر دوڑ جاتی ہے اور تلخ لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ "خدمتِ خلق" اس پہلو کو مکمل طور پر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس افسانے سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"بھائی جان! بچوں کا ڈاکٹر کہاں بیٹھا ہے۔

آج تو کوئی بھی ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود نہیں۔ سنتری نے جواب دیا۔

مگر کیوں؟ شگفتہ نے قدرے حیرانی سے پوچھا:

جی آج وہ اپنے مطالبات کے حق میں ہڑتال پر ہیں۔

کوئی تو ہو گا؟ شگفتہ نے پھر پوچھا۔

کوئی بھی نہیں ہے، سنتری نے گیٹ کی دوسری جانب دیکھتے ہوئے بے زاری سے جواد دیا۔ کیا اتنے بڑے ہسپتال میں کوئی ایک بھی ڈاکٹر نہیں؟

شگفتہ چلاتے ہوئے بولی

جی! میں نے کہا کوئی بھی نہیں۔ اور وہ دوسری جانب چل پڑا۔ "[2]

افسانہ "خدمت خلق" عنوان سے ہی ظاہر ہے۔ کہ ایک ایسے انسان کی کہانی کا ذکر ہے جو اپنی غربت و افلاس کی بدولت اپنے بچے کو کھو دیتا ہے۔ ہمارے سماج کا بھی یہ المیہ ہے کہ جہاں حکومتی نمائندے اپنی ڈیوٹی کے بجائے دیگر کاموں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک غریب

انسان اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جس طرح افسانہ "خدمت خلق" اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے کہ شگفتہ کے پاس پیسے کم ہونے کے باعث پرائیویٹ ہسپتال سے اپنے بچے کا علاج نہیں کرپاتی سرکاری ہسپتال میں جاتے ہوئے وہاں کے ڈاکٹر کی غیر موجودگی اور شگفتہ کا غصے سے طیش میں آجانا۔ اسی کشمکش میں بچے کا فوت ہوجانا۔ یہ تمام تر ایسے حالات وواقعات ہیں جو آج کے سماج میں رچ بس چکے ہیں۔ اسی لیے افسانہ نگار جذباتی انداز اختیار کرتے ہوئے اس افسانے کے اختتام پر یوں رقم طراز ہیں:

> "وہ دیوانی سی ہوچکی تھی۔ پھر نجانے اس نے کیا سوچا اور بچے کو فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ اس کی چیخیں دور دور تک سنی جارہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد لوگوں کا جم غفیر کھڑا ہوچکا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ آپے سے باہر ہو چکی تھی۔ کئی لوگوں نے معصوم بچے کو دیکھ کر افسردگی کے اظہار کے ساتھ ساتھ کچھ رقم بھی دینا شروع کردی۔ شگفتہ بددعائیں دیتے جارہی تھی۔"(3)

یہ افسانہ ایک ایسے کرب کا تذکرہ کرتا ہے جہاں لوگ خدمت خلق کی آڑ میں انسانیت کی توہین کرتے ہیں۔ انسانیت کی بجائے مال و دولت اور منصب وعہدہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں نچلا طبقہ غربت ومظلومیت کی چکی میں پستا جارہا ہوتا ہے۔ اسی کی تصویر افسانہ نگار نے اس جذباتی انداز سے پیش کی ہے کہ یہ ناسور بیماری ہمارے سماج سے کیوں ختم نہیں ہورہی اور ہر انسان کو اس کا پورا حق کیوں فراہم نہیں ہورہا۔

ساجد خان عصر حاضر کے وہ نابغہ روزگار افسانہ نگار ہیں جنہوں نے زندگی سے جُڑے ہر تعلق کو صفحہ قرطاس پر مرتسم کیا۔ چھوٹے چھوٹے اور عام موضوعات جو بظاہر تو کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مگر انہوں نے ان موضوعات کو اس قدر خوبصورت تصویری شکل سے پیش کیا کہ گویا یہ ان کے جذبے کی

انتہا ہو۔ ان کا ایک افسانہ "بیٹی" بھی جذبات واحساسات سے لبریز ہے۔ عبد الرشید اور انور بی بی کی اکلوتی اولاد جو عائشہ ہے، سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ پال پوس کر اور لکھا پڑھا کر ایک دن وہ آتا ہے کہ اس کی شادی کا سامان خریدا جاتا ہے۔ رخصتی ہوتی ہے اور ہر طرف آہ وسسکیوں کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ مگر ان فریادوں میں والدین سر فہرست ہیں۔ اس سلسلے میں افسانہ نگار نے اس کی تصویر کچھ یوں جذباتی کیفیت سے کھینچی ہے:

"عبد الرشید نے انور بی بی سے کہا: "کاش! آج ہمارا کوئی بیٹا بھی ہوتا، جو بہن کی ڈولی کو اپنے کندھے پر اٹھاتا"۔ یہ الفاظ سننا تھے کہ انور بی بی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ عبد الرشید بولا۔ "دیکھوناں! آج ہمارا گھر کتنا سونا ہو چکا ہے۔"

"بیٹیاں رکھنے کے لیے تو نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ ہم اپنی عاشی کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹنے نہ دیتے۔ بس دعا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اللہ اسے اپنے گھر میں سکون دے۔"

انور بی بی نے کہا

عبد الرشید نے آمین کہتے ہوئے اپنی چادر آنکھوں پر رکھ لی۔"(4)

والدین کی محبت کو افسانہ نگار نے اس انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ کہ جس طرح کا انہیں حق ہے۔ بیٹی کا گھر سے جانا اور پھر دو دن بعد والد کا پھر بیٹی کو دیکھنا۔ بیٹی جب گھر ساتویں پر آتی ہے

تو وہ سات دن سات لمحوں میں گزر جاتے ہیں۔ اس طرح وقت گزرتا گیا اور ایک سال بعد عبد الرشید کا نواسا ہونا اور یہ خوشی غم میں بدل جانا، ایک عجیب و غریب کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے:

"عبد الرشید بازار سے سودا سلف لے کر جب واپس آیا تو اُسی کے گھر کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ بھیڑ میں کچھ عورتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ عبد الرشید کو دیکھتے ہی کئی پڑوسی اس کی جانب لپکے۔ ایک دوست نے اسے اپنے دل سے لگا لیا۔ وہ صورت حال سمجھنے سے یکسر قاصر تھا۔ اُس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

"میاں عبد الرشید اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک نواسا دیا ہے مگر ---------بیٹی واپس لے لی ہے۔"

اور پھر وہ بھی سکون کی وادی میں اُتر گیا۔"(5)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کے ہاں ایک جذبہ وجنون ہے۔ جس طرح وہ کسی ایک گھرانے کا ذکر کرتے ہیں مگر حقیقت میں یہ واقعہ ہر اس گھر میں ہے جہاں اولاد کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن کرتے ہیں۔ باقی مرضی اللہ کی ہے کہ وہ خوشیاں دے یا غم۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں اپنے جذبات کو جس لہر میں بہا دیا ہے شاید ہی کوئی لکھاری اس کمال فن سے بخوبی آشنا ہو۔

اسی طرح ساجد خان کا افسانہ "کتمان" بھی انسانی جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ جس میں مصنف نے ہر اس انسانی زندگی پر بحث کی ہے جو اس دار فانی کے پیچھے دھوڑا دھوپ میں لگے رہتے ہیں اور آخرت کو مکمل طور پر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اکثر لوگ ایسے ہیں جو گفتار میں تو بڑے مدلل انداز

سے گفتگو کرتے ہیں مگر ان کا کردار بالکل منفی اور گناہوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے افسانہ "کتمان" سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"لوگ بھی جب رائے دینے پہ آئیں تو زمین وآسمان کے قلابے ملانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ وہ ظاہر دیکھ کر رائے دینے میں حق بجانب ہیں۔۔۔۔۔ بھلا وہ باطن میں اتر بھی کب سکتے ہیں۔۔۔۔۔ میں ان جاہل لوگوں کی باتوں پر کیونکر اعتبار کروں جن کو حقائق کا کوئی علم نہیں۔"(6)

ساجد خان اس افسانے میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دنیا کہ حیثیت مچھر کے پَر برابر بھی نہیں۔ اس جہاں میں وہی انسان کامیاب ہے جو برائیوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ب راہ راست پر آئے اور نیکی کے کاموں میں پیش پیش ہو۔ بعض انسان تو نیکی کے کام سرانجام دے کر بھی اس وسعت کو نہیں پاسکتے جو اس کی اصل منزل مقصود ہے۔ کہ جس طرح مصنف نے پہاڑی پر ایک خوبصورت مسجد کی تصویر کو لفظی جامہ پہنایا ہے۔ بنانے والوں نے مسجد کو تعمیر تو کر دیا مگر اس کو آباد کرنے کے لیے لوگ گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔ اس مسجد کی حالت اب یہ ہو چکی کہ لوگوں کے نہ آنے کی وجہ سے اس پر قفل لگا دیا ہے تا کہ کوئی وحشی جانور یا کوئی چوری ڈکیتی نہ ہو۔ مسجد کے اردگرد اونچی اونچی عمارتیں جو نقش و نگار سے بھرپور ہیں۔ اور ان کے وسط میں مسجد ایک ایسی کیفیت کو ظاہر کر رہی ہے جیسے ستاروں میں چاند چمک رہا ہو۔ مگر یہ چاند کالے بادلوں کی نذر ہو جاتا ہے اور ہر طرف اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ اس مسجد کی تصویر کو مصنف نے یوں پیش کیا ہے:

"وہ چلتے چلتے مسجد کے صد دروازے پر جا پہنچا۔۔۔۔۔۔ اتنا بڑا دروازہ، اس پر خوبصورت نقش نگاری اور قرآنی آیت کے مختلف

رنگوں اور رسم الخطوں میں خطاطی کی نظروں کو ذخیرہ کیے جارہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسجد کے دروازے پر بڑا سا قفل پڑا تھا۔ ۔۔۔۔۔۔۔ یہ دیکھ کر مسجد کے اندر نماز پڑھنے کی خواہش دم توڑ گئی۔"(7)

دراصل افسانہ نگار نے اُس حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو وقت کا داعی اور عالم وخطیب، عاصیوں کو راہ راست بتلاتا ہے اور نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ مصنف نے بھی اس حقیقت سے پردہ اٹھا کر اپنی تحریروں میں تصوف جیسے مضامین کو سمویا ہے۔ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ بدی انسان کو ہمیشہ نقصان کی طرف لے جاتی ہے جبکہ نیکی ہی وہ شے ہے جس کے ذریعے انسان دونوں جہاں میں فلاح پاتا ہے اور کامیابیاں وکامرانیاں اس کے پاؤں چومتی ہیں۔ یہی جذباتی پہلو افسانہ نگار کے افسانوں کا بنیادی وصف ہے جو دوسرے ہم عصر مصنفین سے منفرد اور ممتاز ٹھہراتا ہے۔

افسانہ "کتمان" ہی کی مثل ایک افسانہ "دائرے کا اسیر" بھی ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے دنیاو آخرت کی حقیقت کو عالمانہ اور خطیبانہ انداز میں جذباتی طرز پر بیان کیا ہے۔یعنی انسان کی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ وہ مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا میں اچھے اعمال کرے اور آخرت میں اس کا بہترین پھل حاصل کرے۔ ساتھ ساتھ اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انسان دنیا کی تباہیوں، تاریکیوں، ظلم وجبر اور مایوسیوں کو جب دیکھتا ہے تو وہ بھی فطری طور پر نہ جسمانی سکون حاصل کرتا ہے اور نہ ہی ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ دنیا میں رونما ہونے والے ظلم وستم اور ناانصافیوں کی وجہ محض انسان ہی ہے مگر اس کی شکل وصورت اور فطرت مختلف راہوں میں منقسم ہیں۔ جس کے متعلق افسانہ نگاریوں گویا ہیں:

"وہاں کتے بھونک رہے تھے، چوزے کے پیچھے بلوٹا اور بلوٹے کے پیچھے پلا بھاگ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ بچھیرا بچھیری کو پکڑنے کی کوشش میں تھا وہ سرپٹ دوڑ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سامنے لومڑیاں آپس میں چھیڑ خانی کر رہی تھیں ۔۔۔۔ بندر انہیں دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ چڑیاں شور مچا رہی تھیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ کوے اپنی ہی دنیا میں مگن تھے ۔۔۔۔ چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ کوے اپنی ہی دنیا میں مگن تھے ۔۔۔۔۔ گدھے لمبی تانے سو رہے تھے۔ قدرے دور ایک جانب سور بھی کھڑے تھے۔ جب کتے زور سے بھونکنا شروع ہوئے تو میرے اندر بیٹھا کتا بھی جاگ اٹھا اور بھونکنے لگا۔"(8)

کائنات میں جانوروں کی شکل میں انسان موجود ہیں۔ جو جانوروں کی طرح بد ترین افعال سرانجام دیتے ہیں۔ جس میں خون خرابہ، جان سے مار دینا اور موت کے گھاٹ اتار دینا سر فہرست ہے اور یہ درندگی تو وحشی درندوں کی خصلت ہے جو بغیر سوچے سمجھے اور کم عقلی کی وجہ سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ یہ وصف انسانوں کا نہیں کہ وہ سوروں کی مانند اور کتے اور بھیڑیوں کی طرح درندگی اختیار کریں اور بغیر سوچ و فہم کے دن دھاڑے جب چاہیں درندوں جیسا سلوک اختیار کریں اور انسانی معاشرے میں افراتفری اور انتشار پھیلائیں۔

افسانہ نگار نے دارِ فانی کے بر عکس عاقبت کی حقیقت کو بھی پیش کیا ہے۔ جس طرح انسان کھیت میں جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ یعنی جو انسان دنیا میں جتنی نیکیاں کمائے گا اتنا ہی اسے بہتر صلہ ملے گا۔ جس میں پہلے منزل قبر ہے۔ جس کا تذکرہ مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"سامنے ایک نئی قبر کھودی گئی تھی، نئی ہونے کے باوجود شکستگی عیاں تھی، اطراف میں لگائے گئے تہہ در تہہ پتھر ذرہ بھی خوب صورت نہ تھے۔ اُن میں سوراخ دیکھ کر میں توگھبرا گیا۔ میرے اندر اندھیرا پھیلنے لگا۔ جسم میں بے چینی سرایت کر گئی، میں اداس ہو گیا۔ ایسے لگا جیسے کلیجہ حلق میں اٹکا ہوا ہو۔"(9)

ساجد خان کے افسانوں کی یہ ایک اہم خوبی ہے کہ ان کا یہ جذباتی پہلوان کی تحریروں کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیتا ہے۔ جس طرح انہوں نے آخرت کی زندگی کا ذکر کیا اور اشاعتِ اعمال کا تذکرہ بھی کیا۔ جیسے یہ قبر تو ایک مٹی کی ڈھیری نہیں بلکہ یہ انسان کے کیے اعمال کی وجہ سے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا پھر دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

افسانہ نگار کا یہ اندازِ گفتگو نہ صرف جذباتی انداز فکر کی حامی ہے بلکہ انہوں نے حقیقت سے کام لیتے ہوئے انسانی وجود اور حیات کو بھی اپنا موضوع سخن بنایا ہے اور انسانی معاشرے میں امن و فلاح اور نظم و ضبط کو قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ جذباتی انداز ان کی تحریروں کو ہمیشہ امر کر دیتا ہے۔

2۔ معاشی مسائل:

دنیا کے تمام علوم و فنون اور ادب میں اُس وقت کی ہر طرح کی تہذیبی، سیاسی اور معاشی استحصال کا بیان ملتا ہے۔ جب بھی کوئی ادب تخلیق ہوتا ہے تو اس کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ اس میں انسان معاشرہ اور اس کے حالات وواقعات کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ادب سدا زندہ جاوید بن جاتا ہے۔ شعرا وادباء اور مصنفین جس تعداد میں تخلیقات کو فروغ دے رہے ہیں اس کے پس منظر میں وہ معاشرہ ہے جس کے اندر وہ رہتے ہوئے اس کے حالات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ اسی

انسانی معاشرے کی اقدار و روایات، تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور کلچر و ثقافت جیسے عناصر ان کے فن پاروں کو جلا بخشتے ہیں۔ بعض انسانی معاشرے امن و آسودگی کے تحت اپنی کامیاب و کامران زندگی گزار رہے ہوتے ہیں جبکہ بعض معاشرے بدنظمی اور انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں اور زندگی کی دھوڑ دھوپ میں مسلسل رکاوٹیں درپیش آتی ہیں۔

ساجد خان نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی، پلے بڑھے اور اپنی زندگی گزاری، اس کی زندہ تصویر ان کے افسانوں میں جھلکتی ہے۔ انہوں نے اپنے معاشرے کے مثبت پہلو اور منفی پہلو کو سامنے لا کر نہ صرف ان کے لیے آواز بلند کی بلکہ عملی طور پر مسائل کے حل کے لیے بھی آرزومند ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "اثاثہ" اس بات کا غماز ہے کہ اگر انسان اپنی خواہشات کو ترک کر کے اور قحط کے باوجود اپنی زندگی کو تنگ دستی میں گزار دے تو وہ معاشرہ امن و خوشحالی کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے ایک ایسے شخص کی کہانی کو بیان کیا ہے جو ایک سرکاری ملازم ہے مگر کم تنخواہ اور آمدنی کے باعث وہ اپنے لیے جوتے نہیں خرید سکتا۔ سردی کی وجہ سے پاؤں شل ہو جاتے ہیں مگر پرانے ہی جوتے پہن رکھے ہیں۔ اتنی سکت نہیں کہ وہ اپنے دوستوں کی طرح نئے چمکتے ہوئے جوتے پہنے اور نئے ڈیزائن کے جوتے خریدے۔ اسی معاشی بدحالی کو افسانہ نگار نے افسانہ "اثاثہ" میں کچھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "میرے دوست نئے چمکنے جوتے پہنتے تو ان کی چال ڈھال بھی دیدنی ہوتی۔ میں ان کے جوتوں کی چمک اور ڈیزائن ہی دیکھا کرتا ۔۔۔۔۔۔۔۔ مہنگائی کے اس دور میں بیوی بچوں کو پیٹ بھر کر کھلانے کے لیے مجھے اپنی بہت سی ضروریات ترک کرنا پڑتی تھیں ۔۔۔۔۔۔۔ مکان کا کرایہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ بجلی، گیس اور پانی کے بل ۔۔۔۔۔۔۔۔ بچوں کی روز مرہ کی ضروریات ۔۔۔۔۔۔ خوردو

نوش کا سامان لینے کے بعد جیب خالی ہو جاتی ۔۔۔۔۔۔ ایک تنخواہ
بھلا کتنی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کا سامان کر سکتی
ہے۔"(10)

ساجد خان نے ایک ایسے متوسط طبقے کی زبانی کو سامنے لایا ہے جو کم آمدنی کے باوجود حوصلے سے کام لیتا ہے۔ مصنف نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ معاشرے میں ایسے امیر اور سیٹھ لوگ بھی موجود ہیں جو آمدنی ہونے کے باوجود بھی پرانی چیزوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اب متوسط طبقہ اور بالائی طبقہ دونوں ایک دوسرے کے متوازی ہو چکے ہیں۔ اسی لیے معاشی مسائل کا یہ حل افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے جیسے:

"میرے ارادے کو توانائی اُس سیٹھ کو دیکھ کر ملی جو کروڑوں روپے آمدنی ہونے کے باوجود پرانے جوتے اور پرانی بنیان زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اُسے دیکھ کر میری خود اعتمادی میں دوگنا اضافہ ہو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ میں ایک غریب شخص ہوں اور میرے سامنے لاکھوں کروڑوں روپے کے اثاثہ جات رکھنے والا گزرا ہے۔ اس میں اور مجھ میں صرف کروڑوں کا فرق ہے حالانکہ اس نے بھی جوتے پرانے ہی پہن رکھے ہیں۔ میں احساس شرمندگی کے حصار سے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے نئے جوتے خریدنے والوں اور کئی کئی جوڑے کپڑے سلوانے والوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔"(11)

افسانہ نگار نے جس معاشی پہلو کو منظر عام پر لایا ہے۔ اس کے لیے ایک نیا راستہ اور زاویہ اختیار کیا ہے۔ اگر انسان معاشرے میں عدم مساوات کے بجائے منصفانہ تقسیم پر پورا اترے اور فضول خواہشات کو ترک کر کے اپنی زندگی کا اصل مقصد پہچان لے تو بہت سے مسائل سے اسے چھٹکارا مل سکتا ہے۔

ساجد خان کے دیگر افسانے بھی معاشی مسائل اور ان کے حل کے لیے بہترین مثال ہیں۔ ان کا ایک اہم افسانہ "زمین سکڑ رہی ہے" معاشی مسائل اور استحصال کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے میں اس برائی کی نشاندہی کی ہے جو معاشرے کو بدنظمی اور افراتفری کی جانب لے جانے والی ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار کا خیال و تصور کسی ایک چیز پر نہیں ٹھہرتا۔ بلکہ وہ اس قدر پریشان اور اُداس ہے کہ وہ اس نظام معاشرت سے کیسے لڑے۔ اُداسی، مایوسی اور ناامیدی کیوں کر جنم لیتی ہے اور اس تاریکی کو کیسے اُجالے میں بدلا جائے۔ مصنف اپنے آپ کی موجودگی کو غیر موجودگی تصور کرتا ہے۔ اس معاشرے سے اس قدر بیزار ہو چکے ہیں کہ جیسے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے ہوں۔ جیسے:

> "میں پہاڑی پر بیٹھا ہوں، نہیں کسی جنگل میں گھوم رہا ہوں، نہیں
> کسی دریا میں ڈبلیاں کھا رہا ہوں۔ نہیں شاید کسی میدان میں کھڑا
> ہوں ــــــــ۔ نہیں صحرا میں ریت کھنگال رہا ہوں ــــــ۔
> نہیں نہیں نہیں ــــــــــ۔ کہیں میں بھی ہوں ــــــــ۔
> مگر کہاں ــــــــ؟؟ مجھے معلوم نہیں۔"[12]

افسانہ "زمین سکڑ رہی ہے" میں موجودہ دور کے تمام ان تعلیم یافتہ طبقوں کا ذکر کیا ہے جو اس معاشرے میں انتشار پھیلا رہے ہیں اور ماسوائے دھوکے اور فریب کے کچھ بھی نہیں۔ ہر طرف جھوٹ، ظلم و جبر اور بربریت برپا ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، ناانصافی و بے باکی اور معاشی استحصال کے

لیے دن دھاڑے خون خرابہ کرنا اور جھوٹ، فریب اور دھوکہ کرنا اس معاشرے کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس جیسا نظام معاشرت قائم ہو چکا ہے۔ مگر بغیر کسی خوف وڈر کے افسانہ نگار نے اس نظام کو صفحہ قرطاس پر مرتسم کیا اور اس افسانے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں نے قلم اور قرطاس سے رشتہ جوڑے رکھا پر جو معاشرہ الفاظ کی حرمت کو گنوا دے وہاں ظلم پروان چڑھتا ہے۔

میں نے اپنے تئیں اپنا فرض پورا کیا اور قلم کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی۔۔۔۔۔۔۔۔ میں بہت پہلے ہی قتل کر دیا جاتا۔۔۔۔۔۔ پر جو وقت معین ہے اس سے انکار نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ میں فخر سے قبر میں اتروں گا۔

میں ظلم کو تو نہ روک سکا پر اپنے حصے کا کام بخوبی سر انجام دے چلا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ لوگ میری نعش سے ٹپکتے لہو کو نجس کہہ کر پکاریں گے مجھ پہ طعن و تشنیع کریں گے۔"(13)

افسانہ نگار نے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے حق اور سچ پر مبنی باطل قوتوں سے نجات حاصل کرنے کی از حد کوشش کی ہے کہ انسانی معاشرے میں معاشی مسائل کا حل کیسے بہتر بنایا جاسکتا ہے اور اسی معاشرے میں موجود برائی، ناانصافی، بے رہروی اور بے زاری سے چھٹکارا حاصل ہو۔ لیکن حقیقت میں اس معاشرے کے لوگ استحصال کرنے اور دوسروں کا حق مارنے کے نت نئے راستے تلاش کرتے ہیں۔ جس وجہ سے پسا ہوا طبقہ دکھ، تکلیف اور کرب کی وجہ سے زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ یہ طبقاتی

کشمکش صدیوں جاری وساری رہتی ہے اور ایک کامیاب معاشرے کی تعمیر وترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

اگرچہ افسانہ "زمین سکڑ رہی ہے" مختلف موضوعات پر مبنی ہے۔ مگر اس افسانے کا سب سے اہم اور بنیادی پہلو معاشی مسائل اور لوگوں کے اندر مادیت پسندی ہے۔ ہر انسان شعور رکھنے کے باوجود وہی چیز حاصل کرنے کا متمنی ہے۔ جو اس کے بس کی بات نہیں۔ اسی وجہ سے معاشرہ بدامنی اور انتشار کا سامان مہیا کیے ہوئے ہے۔ جب تک یہ مادیت پسندی جیسی ناسور بیماری ختم نہیں ہوگی تب تک معاشرہ ترقی کی شاہراہوں پر گامزن نہیں ہوسکتا اور معاشی مسائل کے انبار سے نجات حاصل کرکے امن وخوشحالی کو فروغ نہیں دے سکتا۔

ساجد خان نے افسانہ "نئی کہانی" میں بھی معاشی مسائل کو زیر مضمون لایا ہے۔ جب کسی معاشرے میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہو تو وہاں قتل وغارت اور ظلم وجبر ہی جنم لیتا ہے۔ ہر طرف چوری ڈکیتی اور معاشی استحصال کے پے درپے حملے ہوتے ہیں۔ جوان وبوڑھے مرد اور عورتیں بھوک کی وجہ سے ہاتھ میں بھیگ کا پیالہ لیے پھرتے ہیں اور ایک وقت کی روٹی کے لیے ترستے ہیں۔ ان بھیکاریوں میں تو بعض اس برائی پر بھی اتر آتے ہیں کہ چند روپیوں کے عوض اپنی عزت وحرمت کو داؤ پر لگا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں افسانہ نگار نے ایک ایسی عورت کا تذکرہ کیا ہے جو بظاہر تو بھکاری ہے مگر اس کے پس منظر میں کچھ عجیب حالت ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے:

> "وہ جو ایک جانب سے آستین اور دوسری جانب سے بغل چاک کیے کالے کپڑے پہنے اپنے سفید جسم کی جانب راغب کرکے بھیک مانگ رہی تھی۔ جس کا جسم نزدیک سے دیکھتے، اُس سے آنکھیں چار کرنے اور ہاتھ چھونے کی خاطر بے شمار لوگ اپنی جیبیں ٹٹولتے۔ پھر

> نجانے وہ کس ترازو میں اُن کا تول کرتی اور کچھ دیر کے لیے کسی نہ
> کسی کے ساتھ غائب ہو جاتی۔ اُس کے دیکھنے کا انداز بھی تو نرالا تھا۔
> جس کو آنکھ بھر کر دیکھ لیتی وہ اُسی کا ہو کر رہ جاتا۔"(14)

افسانہ نگار نے معاشرے کی اس برائی اور فحاشی کو بھی بیان کیا ہے جو معاشی بدحالی کی وجہ سے پروان چڑھ رہی ہے۔ غربت کے باعث بھیک مانگنا اور چند پیسوں اور رویوں کی لالچ میں اپنے جسم کو فروخت کر کے عریانی پھیلانا ایک انتہائی نازک اور بے شرم مرحلہ ہے۔ مگر مصنف ان تمام پہلوؤں کو تو بیان کر رہا ہے اور عوام میں شعور وادراک کی نئی سمتیں متعین کرنے کی سعی میں مگن ہے۔ لیکن اس حقیقت سے واقفیت ہونے کے باوجود بالائی طبقے سرمایہ دار بن کر دولت پر سانپ کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہے اور نچلا طبقہ جو غربت کی چکی میں پس رہا ہے اور شرم وحیا کی تمام حدود عبور کر کے دولت حاصل کرنے میں محو عمل ہے۔ اگرچہ انسانی معاشرہ غریب نہیں مگر دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی بدولت اسے مفلس بنایا جاتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ برسوں عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے جبکہ پسا ہوا طبقہ زندگی اور موت کی کشمکش میں اپنا جیون گزار دیتا ہے۔

بلاشبہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ساجد خان کے افسانوں میں جابجا معاشی مسائل اور ان کے حل کی ہر ممکن کوشش ملتی ہے۔ وہ جس زاویہ نگاہ سے بہتر سمجھتے ہیں اس کے لیے بہتر حل تلاش کرتے ہیں۔ تاکہ معاشی مسائل پر قابو پایا جاسکے۔ چونکہ معاشی مسائل کسی بھی معاشرے کے لیے مختلف منفی پہلو سامنے لاتا ہے اور معاشرے میں بدنظمی اور انتشار کا باعث بنتے ہیں۔

3۔ رومانیت:

کلاسیکیت اور رومانیت اردو ادب کی دو الگ اصطلاح ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کلاسیکیت میں وفور جذبات، نرگسیت، جوش وہیجان اور سیاسی قیود جیسے عناصر پائے جاتے ہیں جبکہ

رومانیت میں مافوق الفطرت عناصر، تحیر افروزی اور تخیل کی فراوانی جیسے پہلو رومانیت کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور ادیب و نقاد ڈاکٹر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی "کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں یوں رقم طراز ہیں:

> "کلاسیکیت اور رومانیت دراصل دو متضاد ادبی رجحان ہیں۔ وفور جذبات، آزادہ روی، نرگسیت، انانیت، انفرادیت پسندی، وسعت طلبی، فطرت پرستی، جدت طرازی، جوش وہیجان، قرون وسطی سے دلچسپی، فلسفیانہ رتصویریت ومثالیت، ادبی، معاشرتی اور سیاسی قیود کے خلاف بغاوت، مافوق الفطرت، تحیر افروز اور پُراسرار امور سے دلچسپی، تصوف سے شغف، جبلی طرز عمل اور غیر متمدن فطری زندگی کی طرف مراجعت، پرجوش جذبات کا بے ساختہ اظہار، ہیئت پر مواد کی ترجیح، طریقہ راسخہ قدما سے انحراف، عقل پر وجدان کی ترجیح، فطرت پسندی اور تخیل کی فراوانی رومانیت کے نمایاں خدوخال ہیں۔"(15)

مندرجہ بالا اقتباس سے اسی بات کی توضیح ہوتی ہے کہ رومانیت ایک ایسی ادبی اصطلاح ہے جس میں جذبات انگیز کیفیات، عشق انگیز حالت، عاشق مزاجی اور تخیل پرستی جیسے عناصر کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز یورپ سے ہوا اور کلاسیکیت کے مقابلے میں تخیل اور جذبات پر زور دیا گیا جبکہ نفس مضمون کو ہئیت اور طرزِ ادا پر ترجیح دی جانے لگے۔ حقیقت نگاری کے بجائے تخیل اور عشق و محبت کی وارداتِ قلبی رومانیت کا حصہ ہیں۔

ساجد خان بھی ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جو رومانیت اور اس کے مزاج اور کیفیات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں دیگر فکری رجحانات کی طرح رومانیت کا عنصر بھی رچابسا ہے۔ وہ بات کرنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ زبان وبیان پر مکمل گرفت رکھتے ہوئے رومانوی عناصر کو اپنا موضوع سخن بناتے ہیں۔ جس طرح انہوں نے افسانہ "مردہ خانہ" میں ایک کم عمر لڑکے اور اس کی معلمہ کی محبت کا تذکرہ کیا ہے۔ عشق ومحبت کے لیے عمر اور روایات کی کوئی قید نہیں۔ اور طفل مکتب جو ابھی کم عمر بھی ہے اور ناتجربہ کار بھی۔ ایک ایستادہ کے حسن وجمال اور رعنائی کو دیکھ کر اس پر فدا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں افسانہ نگار نے کس خوبی صورتی سے اس کی تصویر کھینچی ہے:

> "اُس کے چہرے کی رنگت کھلی ہوئی تھی۔ اُس کا جسم اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آتشیں ہو چکا تھا۔ اُس کا کنوارا پن اپنے اندر کی چمک عیاں کیے جا رہا تھا۔ بکھرے لمبے سیاہ بال شانوں سے ہوتے ہوئے نیچے لٹک رہے تھے۔ دھوپ میں چہرے کی سرخی دُوگنی ہوئی جارہی تھی۔"(16)

افسانہ "مردہ خانہ" میں افسانہ نگار نے ایک ایسی کہانی کو بیان کیا ہے جو عجیب تذبذب کا شکار ہے۔ اگرچہ وہ عورت اس سے عمر میں زیادہ ہے مگر وہ اس کے باوجود اس کی طرف راغب ہے اور اپنی زندگی اس کے ہمراہ کہیں دور وادیوں میں گھوم پھر کر گزارنا چاہتا ہے۔ مگر یہ خیالی باتین محض وہ اپنے تصورات میں ہی لا سکتا ہے وہ معاشرتی اقدار وروایات سے کبھی بغاوت نہیں کر سکتا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تصورات وخیالات حقیقت میں بدلے اور ایک وقت وہ بھی آیا جب اس نے سرعام اپنی محبوبہ سے کہہ دیے۔ جیسے:

"زندگی، ہاں زندگی، جسم اور روح کا حسین امتزاج۔ روح جس کو ابد تک سفر کرتا ہے اور جسم جس نے لذتوں کو سمیٹ کر انجام کو پہنچنا ہے۔

جسم اپنی لذتوں کی خاطر مسلسل پامال ہوئے جارہا تھا۔ کبھی سکون کے نام پر کبھی منزل پالینے کی خاطر کبھی خوشی اور شادمانی کے حسین دھوکے میں مبتلا ہو کر۔

میں تم کو چاہتا ہوں۔ یہ لفظ دل سے اٹھے اور لبوں تک آتے آتے راستے میں ہی ختم ہو گئے۔ محبت جنس کا دوسرا نام ہے۔ جو جنس، جنس اور بس جنس پر ہی اختتام پذیر ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ میں صرف تمہارا تھا، تمہارا ہوں، تمہارا ہی رہوں گا۔"(17)

مصنف کے نزدیک یہ عشق و محبت اور فطرت پسندی اس قدر ابدی ہو چکی ہے کہ جس میں وہ سب اولیت صبر و قناعت کو قرار دیتے ہیں۔ جلد بازی اور بے صبری نہ صرف وقتی سکون کے لیے سامان مہیا کرتے ہیں بلکہ آنے والی زندگی کو بھی ہلا کر اور جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ کسی بھی چیز کو پانے کے لیے صبر اور قناعت پسندی زندگی کا لازمی جز ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ طفلِ مکتب وقت کے ساتھ ساتھ صبر سے کام لیتے ہوئے اپنی منزل کی جانب کامیابی سے چل پڑتا ہے اور اسے حاصل کر لیتا ہے۔ اگرچہ زمانے اور سماج کی طرف سے اسے اور اس کی محبوبہ کو طنز کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ وقت کے گزرتے لمحوں اور سورج کی چڑھتی کرنوں سے بہت کچھ سیکھ کر آگے کی طرف مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔

افسانہ "مر دہ خانہ" کو پڑھ کر اور اس کا مطالعہ کر کے اس بات کا نتیجہ نکلتا ہے کہ افسانہ نگار نے پختگی سے اس موضوع کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور صبر و استقلال کا درس دیتے ہوئے رومانوی عناصر کو بھی عمدگی سے برتا ہے۔

ساجد خان کا افسانہ "دردِ مشترک" اپنے اندر مختلف موضوعات لیے ہوئے ہے۔ جس میں سب سے نمایاں پہلو رومانوی ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے دو ایسے لوگوں کی کہانی بیان کی ہے جو آپس میں گہری محبت والفت رکھتے ہیں۔ ان دو افراد میں ایک میاں ہے اور دوسری اس کی بیوی ہے۔ درحقیقت یہ رشتہ بھی ایسا ہوتا ہے کہ جو انسانی معاشرے میں امن وسکون قائم کرتا ہے۔ ایک عورت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی فرمانبردار ہو اور اس کا خیال رکھے۔ آپس میں پیار، محبت اور اُلفت کے باہمی اشتراک کی وجہ سے ایک گھر بہشت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اچانک ان میں سے کسی ایک کا دنیا سے چل بسنا دوسرے انسان کے لیے بھی باعث مرگ ہوتا ہے۔ یہی کہانی مصنف نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ کچھ ماہ وسال گزر جانے کے بعد بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے جو اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی ہے۔ شوہر کے دل ودماغ پر اس کے خیالات وتصورات کا بھوت ہر وقت سوار رہتا ہے اور وہ اپنی بیوی کی باتیں بار بار دہراتا ہے۔ جس طرح وہ کہتی تھی:

> "سنیے آپ اکثر کھانا دیر سے کھاتے ہیں۔ بار بار گرم کرنا پڑتا ہے، آپ کھانا وقت پر کھالیا کریں۔ میں نے آپ کے لیے نئ واسکٹ کا درزی کو کہہ دیا تھا۔ آج صبح وہ دے گا، پہنے گا، سچی آپ پر بہت جچتی ہے۔ ڈاکٹروں نے جو دوائی تجویز کی وقت پہ لیجیے گا۔ آپ کو سردی ایک دم پکڑ لیتی ہے۔"(18)

میاں بیوی کی محبت والفت اور درد مشترک ایک جانب مگر افسانہ نگار نے ان کی محبت اور چاہ کو اس انداز سے پیش کیا ہے جو رومانوی پہلو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی انتہائی اہم ہے کہ شوہر اور بیوی کی یہ محبت اپنے عروج پر پہنچی چکی تھی۔ بیوی کی موت کے بعد اس کی باتوں کو یاد کرنا اور قبر پر جا کے رونا ایک الگ کیفیت کو ظاہر کر رہا ہے۔ مگر حقیقتاً یہ رونا دھونا اور یاد کرنا کچھ ہی عرصے کے لیے ہوتا ہے۔ اس دوران انسان خود کو بے بس اور بے سود سمجھتا ہے۔ مگر جو لمحات ساتھ گزرتے ہیں، جو محبت والفت اور باہمی رشتہ بندی شوہر اور بیوی کی یادیں چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر یہ یادیں محدود مدت تک ہی ہوتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو پہلے کی نسبت اگر ایک بار پھر موقع مل جائے تو وہ گزشتہ تمام یادوں کو پل بھر میں بھلا کر اک نئے راستے اور نئی منزل کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ مصنف نے اس افسانے کے اختتام پر کس خوبصورت انداز میں شوہر کی بے باکی کا ذکر کیا ہے:

"کچھ دنوں بعد ایک دلکش چہرے، موٹی سیاہ آنکھوں والی، زندہ رہنے کی امنگ سے بھرپور، خوبصورت جسم کی مالکہ اس کے پلنگ پر انتظار کر رہی تھی۔

جنس مخالف سے محبت اور اُس کی غیر مرئی کشش نے دونوں کو ازدواجی بندھن میں جو باندھ دیا تھا۔"(19)

ساجد خان کے دیگر افسانے بھی رومانوی عناصر لیے ہوئے ہیں۔ ان کا افسانہ "زیست کا قرض" رومانیت پر پورا اترتا ہے۔ جس میں ایک ایسے شخص کا ذکر کیا ہے جو سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی اپنے ماضی کو یاد کر کے والدین کی محبت، بیوی کی محبت اور اولاد کی چاہت نے ایک بار پھر سے جواں بنا دیا ہے

اور زمین و جائیداد ہونے کے باوجود انسانوں کا پیار نہ ملنا بہت بڑا دل شکستہ موڑ ہے۔ جس کو افسانہ نگار نے کچھ ان الفاظ میں برتا ہے:

"وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا چاند کو دیکھ رہا تھا لیکن اُس کا ذہن کہیں اور تھا۔ زندگی کتنی جلدی گزر گئی ہے، اُسے اپنا بچپن، بچپن کے دوست اور بچپن کی شرارتیں یاد آنے لگیں۔ اُس کی سرخ آنکھیں چاند پہ ٹکی تھیں۔ وہ آسمان کی وسعتوں اور وسعتوں میں جگ مگ کرتے ستاروں کو دیکھنے لگا۔ پھر گویا ہوا۔ "نجانے کتنی ہی دنیائیں آباد ہیں؟"۔

اُس کے احساسات کی دنیا جاگ اٹھی۔ اُسے اپنے سارے یار بیلی نظروں کے سامنے گھومتے نظر آنے لگے۔"[20]

یہی نہیں بلکہ افسانہ نگار نے اس افسانے میں اس شخص کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر انسان اس جہان فانی میں مست پر خُمار زندگی گزارتا ہے تو اُسے ایک دن یہ غم و مداوا اٹھانا پڑتا ہے۔ اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے گزرے ایک ایک ساعت اور لمحے دیکھائی دیتے ہیں۔ جیسے:

"بچپن ہی سے کھیتوں، کھیتوں میں بہتی ندیوں، ندیوں میں نہاتے درخت، درختوں کے ساتھ اُبھری سبزے کی مہک اسے بے حد پسند تھی۔ زمین کے درمیان سے گزرتی ندی کی مدھر آواز میں کھو جایا کرتا تھا۔ اُسے اپنی شریک حیات بھی یاد آنے لگی۔ کتنی ہمت والی صابر خاتون تھی۔ کبھی کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔ جیسے حالات بھی

ہوتے خندہ پیشانی سے برداشت کرتی۔ اس نے کھڑکی سے ندی پر
نظر ڈالی۔ رات کو پانی پہ رقصاں چاند کا عکس اور پانی سے منعکس ہوتی
چاند کی روشنی دل کو سکون دینے لگی تھی۔"[21]

مختصر یہ کہ ساجد خان کی تحریروں میں گوں ناگوں موضوعات کی بندش ملتی ہے۔ ہر موضوع ٹھوس بنیادوں پر برتا گیا ہے۔ جذباتی پہلو ہو یا معاشی مسائل کا بیان ہو یا پھر رومانوی عناصر ہوں، اس قدر فکری سطح پر لے آئے ہیں کہ جیسے ان کے بغیر انسانی زندگی کا وجود ممکن نہیں۔ وجود ممکن کیونکر نہ ہو، کیوں کہ انہوں نے جس موضوع کا بھی انتخاب کیا ہے اس کا تعلق انسانی معاشرے کے ساتھ ساتھ جانوروں کی طرزِ زندگی اور حشرات الارض کو بھی زیر بحث لایا ہے اور یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ ان کے افسانوں کو انہی موضوعات نے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

4۔ نفسیاتی پہلو:

لفظ "نفسیات" پائے نسبتی کے آنے سے نفسیاتی اخذ ہے۔ نفسیات کا تعلق انسان کی روح اور اس کے کردار سے ہے جو سائنسی ذریعے سے اخذ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس عمرانیات ایسا علم ہے جو انسان کا مطالعہ اس کے معاشرے اور سماج میں رہن سہن اور طور طریقوں کے متعلق زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اس لیے نفسیات اور عمرانیات دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ بقول نقاد:

"نفسیات میں فرد کا مطالعہ بحیثیت فرد کے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔
جبکہ عمرانیات میں معاشرتی اور گروہی زندگی کو بنیادی حیثیت
حاصل ہے۔ فعلیات Physiology میں بھی موضوع فرد ہے
لیکن فعلیات، اعضاء کے الگ الگ وظائف کا مطالعہ کرتی ہے۔ جبکہ

نفسیات میں فرد کا مطالعہ ایک اکائی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔"(22)

مندرجہ بالا اقتباس میں لفظ اکائی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ انسانوں اور جانداروں کے نفس کی حقیقت اور عمل سے بحث کی جاتی ہے۔ بالخصوص خاص حالات و واقعات کے تناظر میں، نفس سے متعلق باتوں کا علم ہے جو علم النفس کہلاتا ہے۔ اردو زبان وادب کے بیشتر شعرا وادباء نے اپنی تحریروں اور فن پاروں میں اپنے معاشرے کے تمام حالات وواقعات جو ذہنی الجھاؤ اور پیچیدگی پر مبنی ہیں، کو باریک بینی سے دیکھا، پرکھا اور رقم کر دیا۔ نفسیاتی مسائل اور اس کے پیشِ نظر ہونے والے منفی پہلوؤں کو ماہرینِ نفسیات نے پیش کیا اور معاشرتی برائیوں کی شناخت کر کے ان سے نجات حاصل کرنے کی سعی کی۔

عہدِ حاضر کے شعرا و مصنفین میں ان گنت لکھاری موجود ہیں۔ جنہوں نے اس مسئلے کے حل کے لیے نہ صرف کوشش کی بلکہ عملی طور پر اس نقطہ نظر کے متعلق مثبت سرگرمیاں پیش کر رہے ہیں۔ یہ مثبت سرگرمیاں اشعار کی صورت، افسانہ و مختلف فن پاروں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ساجد خان بھی اسی معاشرے کا ایک اہم فرد ہیں جنہوں نے اپنے سماج کی پامال ہوتی اقدار و روایات اور انتشار و بدنظمی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ہر اس فرد کو اپنی تحریروں میں حقیقی رنگ دیا جو ہر طرح کی آسائشات اور سہولیات کے باوجود نفسیاتی فریض بن چکا ہے۔ معاشرے کا ہر فرد اس قدر نفسیاتی ہو چکا ہے کہ قدم قدم پر رکاوٹیں حائل ہو کر مصائب لا رہی ہیں۔ کبھی سائے کو اپنا کہنا اور کبھی اپنے آپ کو سایہ کہنا، عجیب سی کیفیات کو ظاہر کرتا ہے اور اس فرد کو خود اپنے آپ کو تلاش کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ جس کی تصویر افسانہ نگار نے اس انداز سے پیش کی ہے:

"غیر ارادی طور پر جب میں اپنے اندر جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ میں اپنے اندر جھانکا، چاروں طرف سیاہی ہی سیاہی تھی، گہری تاریکی دیکھ کر ایک انجانے خوف سے میرا وجود تھرا اٹھا۔"(23)

جدید معاشرے کی جدید مشینری اور آلات نے بیروزگاری اور غربت پھیلا دی ہے اور معاشرے کا ہر فرد اس وجہ سے پریشان اور مصائب میں گھیرا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ انسان شب وروز میں تمیز کرنے، اپنے آپ کی پہچان رکھنے اور سماجی اقدار وروایات کی شناخت سے قاصر ہو چکا ہے۔ ذہنی آسودگی نہ ملنے کی وجہ سے اب ہر طرف تاریکی اور سیاہی ہی نظر آتی ہے۔ آئینہ میں دیکھ کر بھی جھوٹ ہی لگ رہا ہے کہ انسان ہے بھی کہ نہیں۔ بقول افسانہ نگار:

"میں آئینے کے سامنے تھا۔ اپنے وجود کو چھو لینے کا احساس بھی تھا۔ میرا جسم دسمبر کی یخ ٹھٹھرتی رات کی طرح سرد تھا اور میرے اندر ایک قسم کی ایک دوڑ جاری تھی۔ بھاگم بھاگ۔ ایک غیر مرئی وجود اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لیے مضطرب تھا۔ اُسے اِس گتھی کو سلجھانے کی پڑی تھی۔"(24)

ساجد خان اپنے اس افسانے "سراغ" میں اس نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ معاشرے کے ظلم وجبر اور بربریت کی وجہ سے اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی بہتر راستہ اختیار کیے، منزل کی جستجو کیے بغیر آگے چلتا ہے مگر وہ اس قدر نفسیاتی مریض بن جاتا ہے کہ اسے ہر شے فانی، بے کار اور فضول نظر آتی ہے۔ مگر راہ راست پر چلنے اور اپنی منزل کی شناخت کرنے سے یہ انسان اپنی الجھاؤ کو سلجھاؤ میں تبدیلی کر لیتا ہے اور منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کر لیتا۔ ساتھ ساتھ یہ نفسیاتی ذہن بھی

سمجھ جاتا ہے۔ جس کو افسانہ نگار نے بڑی چابکدستی سے اس نفسیاتی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

علاوہ ازیں افسانہ نگار نے اپنے ایک افسانے "تعاقب" میں ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا۔ مگر خواب تو خواب ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا اب یہ سچ ہو گا۔ اس لیے وہ نفسیاتی اور الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے عزیز و اقارب، رشتہ دار اور والدین سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ روزانہ انہی سوچوں میں گُم رہتا ہے۔ اسے کبھی واش بیسن سے خون نکلتا نظر آتا ہے تو کبھی سوچوں میں کھو جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس خواب کو کچھ یوں لکھا ہے:

> "زمین جھول رہی تھی۔ گھر اس طرح جھوم رہا تھا جیسے کوئی شرابی نشے میں لڑکھڑا رہا ہو۔ کبھی ایک جانب کبھی دوسری جانب۔ سامنے کے دریا میں طغیانی آچکی تھی۔ پہاڑ آپس میں معانقہ کر رہے تھے۔ اچانک چھت میں معانقہ پڑا وہ چلاتے ہوئے اٹھا اور باہر بھاگ نکلا اس نے باہر جاتے ہوئے بہت شور مچایا پیچھے مڑ کے دیکھا تو اس کا مکان ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے والدین بیوی، بچے لقمہ اجل بن چکے تھے۔"(25)

اگرچہ یہ خواب ہے مگر یہ انسان اس قدر مایوسی ہو چکا ہے کہ کلاس نہم میں یہ خواب دیکھا اور کئی برس گزرنے کے بعد اس کی شادی ہوئی۔ بیوی اور بچے ہیں مگر یہ خواب آخر سچ ہوا اور زلزلے کے شدید جھٹکوں نے سب کچھ نیست و نابود کر دیا۔ جب تک یہ خواب حقیقت میں تبدیل نہیں ہوا تھا تب تک اس کی نفسیات اور ذہنی الجھاؤ میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ مختلف حربے استعمال کیے، نیند کی گولیاں کھائیں،

تعویز کیے، قرآن کی تلاوت پر زور دیا گیا۔ مگر وہ کسی طرح آسودگی حاصل نہ کر سکا اور بالآخر حقیقت سامنے آنے پر وہ بغیر اطمینان وسکون کے مزید پریشانی کا سامنا ہوا اور اس طرح اس کی یہ نفسیات بھی اپنی منزل تک پہنچ گئی اور افسانہ نگار نے اس مسئلے کے لیے جو نئی راہ اختیار کی ہے وہ بھی قابل غور ہے۔ اسی طرح دیگر افسانوں میں بھی مصنف نے ایسے نفسیاتی پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو معاشرے میں طرح طرح کے مصائب والم میں مبتلا ہیں۔

5۔ سماجی مسائل:

کسی بھی ملک کی تعمیر وترقی میں صحت مند معاشرہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر دولت کی منصفانہ تقسیم بروئے کار لائی جائے اور عدم توازن کے بجائے خود اعتمادی اور خود اعتدالی کا نظام فروغ دیا جائے تو معاشرے سے انتشار اور غربت ومفلسی کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔

معاشرے میں دو ایسے طبقات ہیں جو غیر متوازی اور جارحانہ انداز اپنائے ہوئے ہیں۔ ان طبقوں میں ایک سرمایہ دار طبقہ جبکہ دوسرا نچلا (پسا ہوا) طبقہ ہے۔ نچلا طبقہ اپنی محنت ومزدوری کرتا ہے۔ جبکہ سرمایہ دار طبقہ بغیر محنت مزدوری کے اور کسی پریشانی سے چین کی زندگی گزارتا ہے۔ جس بنا پر ان دونوں طبقات کے درمیان ایک کشمکش پائی جاتی ہے جسے طبقاتی کشمکش کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی مزید توضیح ڈاکٹر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "دنیا میں نادر اور زودار طبقوں کے درمیان تصادم مفادات کے باعث جو آویزش جاری ہے اسے اشتراکی مصنفین کی اصطلاح میں طبقاتی کشمکش کہا جاتا ہے۔"[26]

ان طبقوں کی یہ کشمکش نہ صرف عدم مساوات پر مبنی ہے بلکہ سیاسی کشمکش اور نظریاتی آویزش میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ طبقاتی کشمکش کا نظریہ کارل مارکس نے اشتراکیت میں پیش کیا۔ ان طبقات پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے سرمایہ دار طبقے کو "بورژوا" کا نام دیا جبکہ محنت کش طبقے کو "پرولتاری یا پرولتاریہ" کہا۔ ان دونوں طبقات کے مابین ایک مسلسل آویزش جاری ہے جس کی وجہ سے ان میں مفاہمت بھی ناممکن ہے۔

اس طبقاتی کشمکش کے مسائل کے حل کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ پرولتاری آمریت کے تحت غیر طبقاتی معاشرہ قائم کریں۔ تاکہ ہر شخص سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیا جاسکے۔ ترقی پسند مصنفین بھی اسی فکر کے علمبردار تھے اور اس کے حل کے لیے نہ صرف کوشش کیں بلکہ عملی طور پر بھی اس کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کیے۔ مگر دولت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم نے یہ طبقاتی کشمکش مزید بڑھادی۔ ترقی پسند مصنفین کے علاوہ آنے والے ہر دور اور ہر تحریک نے اس کے خلاف پُرامن احتجاج کیا اور اس طرح یہ روایت دور حاضر تک آن پہنچی۔

عہد حاضر میں مختلف شعراء وادباء کے ہاں یہ سماجی پہلو اور طبقاتی کشمکش کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ جن میں ایک نام ساجد خان کا بھی ہے۔ جن کی تحریروں میں سماج اور سماج سے جڑے تمام حالات و واقعات کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ تذکرہ اور شعور ٹکڑوں میں نہیں بٹا ہوا بلکہ ایک تجرباتی کل سے متعلق اور منسلک ہے۔ ان کے افسانوں کے بیشتر موضوعات سماجی مسائل اور اس کے حل کے متقاضی ہیں۔ خاص کر ایسے حالات کو پیش کرنا جس میں لوگ شرافت، کا لبادہ اوڑھ کر اپنی ظاہری حالت کو تبدیل کرتے ہیں اور معاشرے میں ایسے گزر بسر کرتے ہیں جیسے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہو، اور پاگل پن کا ناٹک کر کے اپنے جرم کو چھپائے پھرتے ہیں۔ ساجد خان کا افسانہ "پاگل" بھی اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جیسے:

"میں سامنے والی گلی کے موڑ پہ پہنچا ہی تھا کہ ہاہا۔۔۔۔ ہو ہو اور شور نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ایک جانب بھیڑ لگی تھی اور کچھ فاصلے پر مجھے ایک سفید رنگت، بھورے بکھرے لمبے بالوں، بے ترتیب مونچھوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گندگی سے نتھڑے بدبو سے بھرے ۔۔۔۔۔۔۔ وہ کبھی منہ ہی منہ میں منمناتا تو کبھی بڑبڑاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگتا۔"(27)

افسانہ نگار نے یہاں اس پہلو کو بیان کرنے کی سعی کی ہے کہ معاشرے میں جہاں انسان ذہنی توازن کے کھونے سے پاگل ہو جاتا ہے وہاں کے بچے اور لڑکے اس انسان کے ساتھ اس قدر مزاق اڑاتے ہیں کہ وہ مزید مصائب میں پھنس جاتا ہے۔ یہ عمل غیر ضروری اور غیر اخلاقی ہے جس سے معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔ مگر افسانہ نگار آگے چل کر کہتے ہیں:

"میرے قریب ہی دو بزرگ آپس میں محو گفتگو تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ سنا ہے بے چارہ بہت بڑا افسر تھا مگر ساتھی افسروں کے حسد اور بغض کی بھینٹ چڑھ کر دماغ توازن ہی کھو بیٹھا ہے۔"(28)

افسانہ نگار نے اس متعلق بہت سے نظریات قائم کیے ہیں۔ انہوں نے یہ بتایا کہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ مگر حقیقت میں ایک اسے انسان کی کہانی ہے جو اپنے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے اور مشکلات سے لڑ رہا ہے۔ جس سے لوگ ناآشنا ہیں۔ مگر آخر میں کسی پُل پر سے گر کر مر جاتا ہے۔ لیکن حقیقت سے واقف ہونے کے بعد کارد عمل افسانہ نگار نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"عوامی اور سماجی حلقوں کے لگائے گئے تمام اندازے اور قیافے غلط ثابت ہوئے۔ اخبار کے مطابق وہ ایک قاتل اور اشتہاری مجرم تھا جس نے ایک لڑکی کا آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ لوگ اخبار کی تفصیلات پڑھنے کے بعد زمین کو ہاتھ لگاتے اور کانوں کو چھوتے ہوئے پائے گئے۔"(29)

افسانہ نگار نے عمیق نظری سے اس سماجی پہلو کو بیان کیا ہے کہ معاشرے میں ایسے حالات تب جنم لیتے ہیں جب غربت وافلاس پھیل جائے۔ جب ہر طرف طرف ظلم وجبر کی راہیں روشن ہوں۔ تب قتل وغارت گری، چوری ڈکیتی اور سماجی استحصال جیسی برائیاں جنم لیتی ہیں۔

اسی طرح ساجد خان کا افسانہ "غلاظت" بھی سماجی مسائل کو حقیقت سے بیان کرتا ہے۔ جس کا موضوع بیروزگاری اور مفلسی ہی ہے۔ جس کے باعث معاشرے کا پسا ہوا طبقہ زندگی اور موت کی کشمکش میں اپنی زندگی گزارتا ہے۔ مگر ایک دن ایسا بھی تعین کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے چہرے کو تبدیل کر لیتا ہے اور غلط راہوں پر چل نکلتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ کب تک شرم وحیا کے پردوں میں جیے۔ اسی بے چینی واضطرابی اور معاشرتی پابندیوں کو وہ ایک دن توڑ کر اپنے آپ کو ملیامیٹ کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ بقول ساجد خان:

"ایک ضرورت جو تسکین کا باعث ہے۔ بے چینی اور اضطراب کا موجب بن رہی تھی۔ وہ کیا کرتا؟ سماج اور معاشرے کی پابندیاں اس جذبے کی تسکین میں حائل جو تھیں۔ طوفان اندر ہی اندر سب کچھ ملیامیٹ کر رہا تھا۔ خواہش کی لہر اُس کے اندر ہی اندر اٹھتی اور نا

آسودگی کا باعث بن کر بے چینی میں مزید اضافی کر دیتی۔ کسی بھی شہ کی محرومی انسان کو کمتر سا کیوں بنا دیتی ہے؟"(30)

آج کا جدید معاشرہ بیروزگاری کے علاوہ دھوکا اور فراڈ پر انحصار کرتا ہے۔ ہر فرد کا ظاہر اور باطن بالکل الگ ہے۔ بے وقوف بنانے، دھوکا دینے اور مطلب نکالنے کے لیے چہرے پر کئی چہرے سجا رکھتے ہیں۔ اسی لیے افسانہ نگار اس معاشرے کے طور طریقوں اور استحصال سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ جس سماج میں وہ رہتے ہیں وہاں بے حسی، مکر و فریب، دھوکا، ناانصافی، جھوٹ اور ظلم و ستم جیسے عناصر نے جنم لیا ہوا ہے۔ جس سے مصنف پریشان ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ وہ اس غلیظ معاشرے کا حصہ ہے جو اسے بھی اس غلاظت میں جکڑ لے گا۔ اس کے حل اور آسودگی حاصل کرنے کے لیے وہ ہر ناممکن کوشش کرتے ہیں مگر زمانے کے یہ دکھ اور پریشانیاں مصنف کو ہر وقت اکتائے رکھتی ہیں اور وہ بیزار نظر آتے ہیں۔ جیسے:

"جس طرح کی آسودگی میں چاہتا ہوں وہ مجھے میسر نہیں اور جو مجھے میسر ہے اُس میں آسودگی نہیں۔ آسودگی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ایک دن میں بھی آسودگان خاک میں مل جاؤں گا۔"(31)

بعض اوقات انسان کے پاس دنیا کی ہر چیز موجود ہوتی ہے مگر اسے ذہنی آسودگی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ یہ نہ صرف مرد کی زندگی کا حصہ ہے بلکہ عورت بھی انہی مسائل سے دوچار ہے۔ اگرچہ وہ بھی ملازمہ ہے، آمدنی بھی اچھی ہے مگر والدین کا فکر وخیال اسے پریشانیوں اور مصائب میں گرفتار کر کے اسے ذہنی مریض بنا دیتا ہے جس کا تذکرہ افسانہ نگار نے اپنے افسانے "غلاظت" میں کیا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ جب انسان غربت اور مفلسی کا شکار ہو جائے تو وہ ذہنی مریض بن جاتا ہے مگر معاشرہ اسے یہ سمجھتا ہے کہ اس پر جن اور بھوت کا اثر ہو چکا ہے۔ بالآخر ذہنی آسودگی نہ ملنے کی وجہ سے وہ انسان اس دارِ فانی

کو الوداع کہہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خود کشی کر لیتا ہے یا پھر اپنے آپ کو حالات کے ہاتھوں مجبور ہوتا دیکھ کر حوصلے پست کرا دیتا ہے۔

افسانہ نگار نے سماجی مسائل کو ہر زاویہ نگاہ سے دیکھا اور اس کے حل نے کے لیے نت نئے تجربات کیے۔ تاکہ ان مسائل سے عوام کو روشناس کرا کے ان میں شعور وادراک کی نئ راہیں متعین کی جائیں اور سماج میں ہر طرح کے منفی پہلوؤں سے نجات حاصل کی جائے۔

علاوہ ازیں افسانہ نگار نے افسانہ "نئ کہانی" میں بھی معاشرتی مسائل کے ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔ جس میں ناانصافی، عوام کی بربریت، حاکموں کا ظلم وجبر اور تشدد جیسے عناصر شامل ہیں۔ ساتھ ساتھ جدید معاشرے کے ایسے گھرانوں کا تذکرہ کیا ہے جہاں بچے بھوک سے بلک رہے ہیں اور سرمایہ دار طبقہ بے حسی سے یہ نظارہ دیکھتا ہے۔ دوسری طرف یہی بھوک عورت کو مجبور کر رہی ہے کہ ایک بھکاری بن کر ہر گلی، شہر، دکان، سڑک اور چوراہے پر کھڑی نظر آتی ہے۔ گالیاں سننی پڑتی ہیں، دھکے کھانے پڑتے ہیں اور اس سے بڑھ کر وہ اپنی عصمت کو نہیں سنبھال سکتی۔ یہ کیسا بے حس اور بے درد سماج ہے۔ کسی کو کچھ خیال وفکر نہیں۔ کوئی جیتا ہے یا مرتا ہے۔

ساجد خان اس افسانے میں یہی کہتے ہیں کہ ایسی بہت سی کہانیاں لکھی جاچکی ہیں اور محض لکھنے سے یہ فعل بے سود ہے۔ جب تک عملی طور پر اس پر عملی درآمد نہ کیا گیا تو پسا ہوا طبقہ مزید غربت کی چکی میں پستا رہے گا۔ امیر، امیر تر ہوتا رہے گا۔

بقول افسانہ نگار:

> "جہاں محسوسات، احساسات اور خیالات کی کوئی قدر نہ ہو۔ جہاں
> علمی خزینے زدری کی طرح فٹ پاتھوں پہ ڈھول پھانک رہے ہوں۔

جہاں لفظوں کے کاریگر پاگل تصور کیے جاتے ہوں۔ جہاں انسان منڈی کی اشیاء کی طرح مایا کے ترازو میں تولا جائے۔ جہاں مذہب کے نام پر گردنیں کاٹی جائیں۔ جہاں انسانی زندگی کی کوئی قدر نہ ہو۔ جہاں اللہ کے نام پر دھوکا دیا جاتا ہو۔ جہاں روٹی کے لیے عصمتیں نیلام ہوتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا وہاں کہانی کا لکھنا ضروری ہے؟"(32)

ساجد خان اس سماج سے اس قدر بیزار ہو چکے ہیں کہ وہ اپنے لفظوں سے خود شرمندہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سماج کا ہر فرد سنگ دل اور مظلوم پر ہی ظلم روا رکھتے ہیں۔ سچ کا کوئی ساتھی نہیں اور جھوٹ کی بغلیں خوب بجتی ہیں۔ افسانہ نگار کے خیالات واحساسات کا کوئی بھرم نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے متبادل اسے قدم قدم پر تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لوگ اسے پاگل جانتے ہیں۔ مگر افسانہ نگار اس قدر ہمت سے اور صبر واستقلال سے بے خوف و بے دھڑک لکھتے جاتے ہیں اور عوامی و سماجی مسائل کو لفظوں کا پیرہن پہنا کر تحریر کرتے جاتے ہیں۔ تاکہ طبقاتی کشمکش اور سماجی مسائل کو معاشرے سے ختم کر کے ایک نئے اور کامیاب و مستحکم سماج کی تشکیل ہو۔

6۔ تانیثیت:

عربی کے لفظ "تانیث" سے ماخوذ ہے۔ جسے انگریزی میں Feminism کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ لفظ لاطینی اصطلاح "Femina" کا مترادف ہے۔ لفظ "تانیثیت" کے لفظی معنی تحریک نسواں، نظریہ وحقوقِ نسواں اور نسوانیت کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں تانیثیت سے مراد وہ باضابطہ نظامِ حیات جس میں عورت کو مرد کے شانہ بشانہ ہر طرح کی آزادی اور حقوق میسر ہوں۔ جن میں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، اخلاقی اور تہذیبی پہلو نمایاں ہیں۔ یہ ایسی تحریک تھی جس میں دونوں جنس کے لیے

مساویانہ حقوق کے لیے آواز بلند کی گئی۔ اس کے علاوہ خواتین کے لیے جدت پسندی اور اعتدال روی سے سیاسی، سماجی، اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے جنس کی تخصیص و تشخص کے برخلاف برابری قائم کرنے پر زور دیا گیا۔ اس تحریک نے چند ہی برسوں میں ترقی پائی اور دنیا کے ہر ادب میں اس نسوانی استحصال پر قلم جُنبش میں آیا۔ اس تحریک کا اثر اردو ادب میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ شعراء و مصنفین نے اس جنسی جبر و دہشت کی نہ صرف اپنا موضوع بنایا بلکہ اس کے خاتمے کے لیے بھی عملی اقدامات کیے۔ ان میں ایک نام ساجد خان کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع سماج سے جڑی اقدار وروایات کو بنایا۔ دیگر سماجی و معاشرتی مسائل کے علاوہ انہوں نے خواتین کے مقام و مرتبے کو صفحہ قرطاس پر مرتسم کیا اور نسائیت کے حوالے سے ان کے تمام نبیادی حقوق پر قلم اٹھایا۔

ساجد خان اپنے افسانوں کا موضوع تخیل سے نہیں اخذ کرتے بلکہ وہ جو دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اسے بعینہ پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ "مردہ خانہ" جس طرح عورت کے حقوق، مسائل اور ان کے حل پر بحث کرتا ہے۔ اسی طرح اس افسانے میں عورت کی آزادی، معاشرتی اور سماجی روایات زندگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "عورتیں زبان کے چٹخارے کی خاطر کہہ رہیں تھی۔ اجی۔ حد درجہ بے شرم نکلی۔ معصوم کو جال میں پھنسا کر اپنا خصم بنا لیا۔ ایسی کالی کلوٹی کو کہاں ایسا چاند سے مکھرے والا ملنا تھا۔ عمر میں بچوں کے برابر۔ "(33)

ساجد خان نے ایک ایسے سماج پر قلم اٹھایا ہے جو عورت پر مسلسل جبر ڈھائے ہوئے ہیں۔ وہی عورت جو اس سماج کا حصہ ہے مگر بجائے اپنی اصلاح کے دوسروں پر کڑی تنقید کرتی ہیں اور کہتی ہیں:

"اس کی بھانجی بھی ساتھ والے سکول میں معلمہ تھی۔ ناک پہ مکھی بیٹھنے نہیں دیا کرتی تھی۔ سکول مالک کے بیٹے پہ ایسے ڈورے ڈالے کہ آج چار بچوں کی ماں ہے۔ ساتھ والی نے اپنی کرسی گھسیٹی اور سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ارے ان کی کون کون سی بات کی جائے۔ تمہیں پتہ ہے وہ پرائیویٹ سکول والی، ساتھ والیوں سے، استغفار استغفار۔"(34)

سماج کی عورتیں دوسری عورت پر کڑی نظر رکھتی ہیں اور تنقید کے گہرے نشتر چلاتی ہیں۔ انہیں دوسری عورت کے حقوق ملنے پر سخت کوفت ہوتی ہے۔ اور بے دھڑک کہہ اٹھتی ہیں:

"وہ اس کی دوسری سہیلی جس کا خاوند دوبئی سے خاصی رقم بھیج دیتا ہے وہ یہاں خوب گل کھلائے جارہی ہے۔ ہر وقت کھڑکی سے لٹکے گلی میں آتے جاتے مردوں کو گھورتی رہتی ہے۔"(35)

معاشرے کی وہ عورتیں جو اپنی محنت مزدوری اور تنخواہ کی صورت میں اپنا گھر چلاتی ہیں۔ انہیں بھی طنز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس عورت کو کسی جانور (کتیا) سے تشبیہ دیتی ہیں۔ یہ ہمارا ایسا سماج ہے جس کو افسانہ نگار نے حقیقت نگاری کا رنگ دے کر معاشرے کی اصلاح کی اور اپنے قلم سے الفاظ کی تان بان کر کے اس سماجی استحصال اور ظلم و جبر کو اپنا موضوع بنایا۔

علاوہ ازیں افسانہ نگار نے ایسے موضوعات بھی تخلیق کیے جو خالصتاً عورت کی زندگی کے متعلق ہیں۔ ایک افسانہ "جواز" میں ایک ایسی خاتون کا ذکر کیا ہے جو افسانہ نگار سے ملنے کی وجہ سے قتل کر دی

جاتی ہے۔ یعنی ہمارا سماج اس حد تک پہنچ جات ہے کہ وہ سمائی و صداقت جانے بغیر خون خرابہ اور طنز و مزاح کرتے ہیں اور عورت کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ بقول مصنف:

"صبح ناشتے کی میز پر اخبار کے سرورق کی شہ سُرخی پر نظر پڑی تو میں لرز گیا۔ "ایک خوبرو کا لرزہ خیز قتل"۔ میں نے غور سے چوکھٹے میں لگی تصویر کو دیکھا تو میں پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا۔ یہ تو وہی تھی جو کل مجھ سے ملنے آئی تھی۔ مگر اسے قتل کیوں کر دیا گیا"؟[36]

مصنف کے بقول عورت نام ہی شرم و حیا کا ہے۔ جب ایک عورت افسانہ نگار سے ملاقات کرتی ہے اور اپنے بارے میں لکھنے کو کہتی ہے۔ مگر اس کے بعد دوسرے دن اس عورت پر ظلم و ستم ڈھائے گئے اور صفحہ ہستی سے نام و نشان مٹا دیا۔

اسی طرح افسانہ "اُس پار" میں ایک ایسی عورت کا تذکرہ کیا جو زمانے کے دکھ درد اور مصائب کا مردانگی سے مقابلہ کرتی ہے اور اپنے شوہر کے مرنے کے بعد گھریلو معاملات خود بطریق احسن نبھاتی ہے۔ جیسے:

"وہ عباس پور گاؤں کی نکڑ پر کچے گھر میں زندگی کو دھکا دیئے جا رہی تھی بلکہ زندگی اسے دھکا دیے جا رہی تھیں۔ ماسی صغری محلے کے تمام مردوں، عورتوں، بچوں اور بچیوں کی ماسی تھی۔ اپنی گزر بسر کے لیے وہ بچوں کے کپڑے سیتی اور شام کو قرآن پاک کا سبق پڑھایا کرتی تھی۔"[37]

آج کے جدید معاشرے میں عورت اپنا مقام و مرتبہ کھو بیٹھی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سماج نسوانی حقوق و فرائض سے بے خبر ہے۔ شعور نہ ہونے کے باعث عورت پر جبر کرنا اور اسے اپنے سے کم تر سمجھنا ایک رسم بن چکی ہے۔ دوسری جانب یہ تصور کیا جاتا ہے کہ عورت محض گھریلو معاملات تک ہی محدود ہے اور اسے باہر نکلنے یا دنیا کی شناخت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب عورت کا سہارا ٹوٹ جاتا ہے تو وہ شعور نہ رکھنے کے باعث در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے اور ان کا آشکار اگلیوں، محلوں، سڑکوں، دکانوں، چوراہوں اور شہروں میں ہوتا ہے۔ عورت کی تذلیل ہوتی ہے اور ایک وقت کی روٹی کے لیے مختلف قسم کے افعال سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ جن میں بھیک مانگنا، نوکری کرنا، پانی بھرنا اور دیگر امور بروئے کار لانا شامل ہیں۔

افسانہ نگار نے افسانہ "پانچ کا پینتالیسی" میں جس عورت کو پیش کیا ہے جو دو فن کا بوجھ اٹھائے کباڑ چنتی ہے اور اس کے بدلے میں محلے کے بچوں میں پتیسے فروخت کرتی ہے۔ جو عمر کے لحاظ سے درمیانی ہے جبکہ پھٹے پرانے کپڑے اور شرابور بدن لیے گلیوں میں آواز لگاتی ہے۔ جس کے متعلق ساجد خان یوں کہتے ہیں:

> "ایک دروازے کے سامنے گندمی رنگ، لمبے قد، سیاہ بالوں، گہری کالی آنکھیں اور پرانے سے کپڑوں میں ملبوس درمیانی عمر کی عورت کھڑی تھی۔ میں گھر کی چوکھٹ پہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ کب اس کا کام ختم ہو اور یہ محلے سے باہر نکلے تاکہ میں جا کر سکون کی نیند سو سکوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر سے کچھ بچے باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک ایک روپیہ تھا۔ بچے اس عورت کے پاس آکر اس سے پتیسے لینے لگے۔ اس نے اپنی ٹوکری پر سے

میلی سی چادر ہٹائی اور تھوڑا تھوڑا پتیسہ اخبار کے کٹے ہوئے
چھوٹے کاغذ پہ رکھ کر بچوں کے حوالے کیا۔ بچے مزے لے لے کر
کھانے لگے۔"[38]

یہ ایک ایسا کردار ہے جو آج کے سماج کی ترجمانی کرتا ہے۔ چند لقموں کے لیے عورت اپنی عصمت اور حیا کو پس پُشت ڈال کر معاشرے کے سامنے آتی ہے اور اس معاشرے میں بیشتر افراد ایسے ہیں جو اس عورت پر نہ صرف طنزومزاح کے نشتر چلاتے ہیں بلکہ بلاواسطہ اس کی تذلیل اور عزت پر بھی ڈاکے ڈالتے ہیں۔ جب کہ عورت مجبور اور بے بس ہو کر اس فعل کو بجا لیتی ہے اور افراد کو تسلی ملتی ہے۔ یہی عمل اس افسانے میں عورت کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس کے کمائے چند روپیوں کی وجہ سے اسے بہت کچھ ہسنا پڑ رہا ہے۔ بقول ساجد خان:

"نوجوان سالڑکا باہر آیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عورت سے مخاطب ہوا کہ "نکالو بچے کے باقی پیسے"۔ عورت نے کہا" باقی کے کون سے پیسے۔"

"باقی کے کون سے پیسے"؟

"تم نے بچے کو پانچ روپے کا پتیسہ دے کر پچاس روپے لے لیے ہیں
اور پوچھتی ہے کون سے پیسے"۔۔۔۔۔۔۔ وہ قسمیں اٹھانے لگی" بابو
جی مجھے اللہ کی قسم، میرے بچوں کی قسم، مدینے کی قسم، مکے کی قسم،
اس بچے کے پاس پانچ روپے کا ہی نوٹ تھا"۔۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنی
قمیص کے نیچے پہنی بنیان سے سارے نوٹ نکال کر ٹوکری میں رکھ

دبے۔ ٹوکری میں رکھے پیسوں میں پچاس کا نوٹ سرے سے تھا ہی
نہیں۔"(39)

اس افسانے میں ایک ایسی مظلوم عورت کا تذکرہ ہے جو رزق حلال سے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے اور محنت و مشقت سے کباڑ اکٹھا کر کے وزن اور بوجھ لیے چلتی ہے۔ بعض اوقات اسے دھتکارا جاتا ہے اور بعض دفعہ اپنی عزت کو داؤ پہ لگا کر اپنے صفائی دینی پڑتی ہے۔ اگر معاشرے میں غربت و افلاس ہو گی تو عورت کیا کرے گی؟ وہ بھوک اور فاقوں سے مرے؟ یا کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ نہیں، عورت نام ہی حیا اور پردہ ہے۔ مگر اس سماجی استحصال کی زد میں آکر عورت اپنا مقام و مرتبہ کھو رہی ہے۔ اور اپنی عصمت کو بھول کر رزق کی تلاش میں در در جانا پڑتا ہے جو آج کے جدید معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

یہ سماج عورت کی عزت پر ڈاکے ڈال رہا ہے اور اسے مجبور کر کے اس کی دولت کو ہڑپ کرنے پر تُلا ہے۔ عورت اپنی عصمت کو سنبھالنے کی فکر میں سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہے۔

افسانہ نگار نے اپنی تحریروں میں نسوانیت کی طرزِ زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور رقم کیا۔ سماج میں کچھ خواتین ایسی بھی ہیں جو بظاہر تو تعلیم یافتہ اور دانا ہیں مگر پس پردہ اُن کے کردار اور افعال ناقابل برداشت ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود یہ عورتیں اپنی عزت کو نہیں بچاتیں اور بہتر عہدے اور منصب کے لیے ان کے محرکات دلبر داشتہ ہیں۔ افسانہ: "انقلاب" سے چند اقتباس دیکھیے:

"کٹے ہوئے خوب صورت سنہری بال، باریک جالی دار قمیص، اُس
کی سفید رنگت کو اور نکھار رہی تھی۔ وہ محفل میں یوں نظر آرہی
تھی کہ جیسے چودھویں کا چاند اپنی چاندنی ہر سو بکھیر رہا ہو۔ اُس کی

گفتگو میں خوب صورت جملوں کا استعمال، چہرے کی مسکراہٹ، سفید چمکتے دانت، ہونٹوں اور ہاتھوں کی جنبش بھی اس کی شخصیت کی جاذبیت میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ بڑے سلیقے سے چلتی۔ جس سے بھی گفتگو کرتی اُس کی آنکھوں کے راستے سیدھا دل میں اترنے کی کوشش کرتی۔"(40)

ساجد خان کے نزدیک جب عورت کو مکمل آزادی دی جاتی ہے تو پھر یہ مختلف چہرے لے کر سماج میں چھا جاتی ہے۔ بظاہر تو اس کا چہرہ شریف اور سادہ معلوم ہوتا ہے مگر پس پردہ یہی تعلیم اس عورت کے لیے باعثِ جہنم بنتی ہے۔ مصنف نے افسانے کے آخر میں اس عورت کو یوں بیان کیا ہے:

"چند روز بعد اخبار کے صفحہ اول پر تین کالمی شہ سرخی لگی ہوئی تھی۔
"شازیہ ثاقب اور مقامی ایم این اے گلفراز ہوٹل سے رنگے ہاتھوں گرفتار۔"(41)

غرض یہ کہ آج کے معاشرے میں عورت ہی وہ ہے جو معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے یا پھر یہ سماج میں رکاوٹ اور بدتہذیبی کو جنم دیتی ہے۔ مگر عورت کی نگرانی اور نگہداشت احسن طریقے سے نبھائی جائے اور ان کے حقوق اور بہتر تعلیم و تربیت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی جائے تاکہ مستقبل میں ایسا کوئی فعل پیدا نہ ہو جس سے سماج و ملک پر منفی اثرات مرتب ہوں۔

7۔سیاسی پہلو:

ساجد خان کے افسانوں میں بیش بہا مختلف نوعیت کے فکری رجحانات کار فرما ہیں۔ وہ سماج سے جڑے ہر پہلو کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ عوام الناس میں شعور و ادراک کی نت نئ راہوں کا تعین کرتے ہیں اور ان کے مسائل کے حل کے لیے مثبت اقدامات سر انجام دیتے ہیں۔

ساجد خان کے افسانوں مین دیگر موضوعات کی طرح سیاسی پہلو کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ وہ عوام کی بے شعوری اور حکومتی نمائندوں کی چالاکی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا نہ صرف اس سے شعور حاصل کرتا ہے بلکہ وہ ان کی چالاکی اور ہوشیاری سے بھی بخوبی آشنا ہوتا ہے۔ افسانہ نگار نے عصر حاضر کی سیاست اور عوام کی بے وقوفی اور نادانی کو فن کاری سے پیش کیا ہے۔

افسانہ نگار نے اس دور کی گندی سیاست اور موقع پرست لوگوں کا تجزیہ کیا ہے۔ ایسی سیاست جس میں کیے گئے وعدوں کی تکمیل نہیں ہوتی، کوئی ہمدردی اور کوئی بھائی چارہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حکومتی نمائندے اپنے مفاد کی خاطر نوجوان نسل کا استعمال کرکے اپنی شہرت بناتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ نمائندے عوام کو سبز باغ دکھانے کی لالچ میں ان کا استعمال کرتے ہیں اور نوبت یہاں تک آن پہنچتی ہے کہ یہ سیاست، غلاظت میں تبدیل ہوکر قتل وغارت گری اور خون ریزی جیسے پہلو جنم لیتی ہے۔ چند لوگ اپنے مفاد کی خاطر حکومتی نمائندوں سے گٹھ جوڑ بنا کر انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ آج کی سیاست میں ایک عجیب وغریب صورت تحال بن چکی ہے۔ جس کی تصویر افسانہ نگار نے اپنے افسانہ "وی" میں یون بیان کی ہے:

> "حالات اس قدر بدل چکے تھے کہ اب ہر کوئی خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ مختلف شہروں میں پے درپے دھماکوں نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پڑوسی ممالک بھی اپنے مفاد کی تکمیل کی

خاطر ملکی حالات پر اثرات مرتب کر رہے تھے۔ ایک جانب کی محفوظ سرحد بھی غیر محفوظ ہو چکی تھی۔ کئی اپنے، دشمن ممالک کے ہاتھوں میں کھلونوں کا کام بھی سر انجام دے رہے تھے۔ مسالک جو اپنے اندر ہی اندر ایک دوسرے کو کاٹے جا رہے تھے، اب کُھل کر سامنے لڑ رہے تھے۔ کوئی کسی کی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔"(42)

ایک طرف ملکی حالات کا انتشار جبکہ دوسری طرف سیاسی نمائندوں میں لڑائی اور اپنے اپنے مفاد کی خاطر ملک و قوم کا غلط استعمال انتہائی منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ مذہبی قائدین اسلام کے نام پر جھوٹ اور فساد پھیلاتے ہیں جس کی وجہ سے عوام مختلف مسالک میں بٹ چکی ہے۔ جب یہ تمام عناصر تیزی سے ملک و سماج میں رونما ہوتے ہیں تو پھر وہاں امن و چین کا نام و نشان تک ختم ہو جاتا ہے۔ بقول افسانہ نگار:

"جس ملک کی سیاسی قیادت جھوٹ اور مذہبی رہنما فریب پر اُتر آئیں۔ وہاں کون سا امن اور سلامتی۔ یہ سارے سمجھتے ہیں کہ ان کو دیکھنے والے اندھے اور سننے والے بہرے ہیں۔ جن کے پاس سوچنے، سمجھنے کی کوئی حس نہیں۔ عام آدمی بھلا ایسے حالات میں کیسے متاثر نہ ہو۔"(43)

آج کی سیاست میں سیاست دان اپنے مطلب کے لیے کسی عام انسان کو دلدل میں پھنسا کر اپنی پارٹی کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ یہی وہ عام انسان اپنے خاندان اور گھر کے لیے سب سے خاص ہوتا ہے۔ سیاسی نمائندے اس کو لالچ دے کر اور سبز باغ دیکھا کر اچھی اچھی جگہوں پر سیر کرواتے ہیں اور مہنگے ہوٹلوں میں کھانا کھلاتے ہیں۔ مگر اس کے پس منظر میں وہ اتنی پھرتی اور چالاکی سے اس شخص کو اپنی سیاست کے

مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کر کے دوسری پارٹی کے منتخب سیاسی نمائندے کو قتل کروادینے پر امادہ کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ شخص قتل کر کے خود کو بھی الجھن میں ڈال دیتا ہے اور قانون کے ہاتھوں اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ جب کہ سیاسی نمائندے بجائے مدد کرنے کے دور بھاگتے اور آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ ملکی صورتحال اور سیاسی عہدے داروں کو افسانہ نگار نے حقیقت نگاری سے پیش کیا ہے۔ جو اپنا مطلب نکلی جانے کے بعد عوام پر بجائے نظرِ کرم کے، ان سے دور بھاگتے ہیں۔ ان سیاسی نمائندوں کو کوئی بے چینی اور پریشانی نہیں کیونکہ ان کا مطلب پورا ہو چکا ہے۔ اب چاہے کسی کو پھانسی ملے یا پھر دھتکارا جائے، ان کا کوئی سہارا نہیں۔ بے یارو مددگار منتظر رہتے ہیں۔ مگر عہدے دار اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ وہ ٹس سے مَس نہیں ہوتے۔ ہر وقت جھوٹ بولنا، جھوٹی قسمیں کھانا، فریب دینا اور امن وخوشحالی کے جھوٹے نعرے لگانا ان نمائندوں کی بنیادی خصلت ہے جو سماج کی تعمیر و ترقی میں نہ صرف انتشار پھیلا رہے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ معاشرے کی فلاح و بہبود پر قابض ہو کر سب کچھ خود ہی ہڑپ کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔ عوام فاقوں سے مر رہی ہے۔ بچے بھوک سے بلک بلک کر روتے ہیں مگر حکمران اور سیاست دان اپنی زندگی اور عیش و عشرت میں محو عمل ہیں۔ ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں:

> "بچے بھوک سے بلک رہے ہیں کچھ تو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھ رہے ہیں۔ غذائی قلت نے سب کو اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے انسانیت کہاں ہے ؟؟ شاید سب پر غنودگی چھائی ہوئی ہے۔ وہ جو سہانے خواب دکھا رہے ہیں۔ جو کبھی انصاف کے نام پہ کبھی تبدیلی کا کہہ کر، کبھی حقوق دلوانے کی خاطر، ہمیں ہانکے پکارے جا رہے ہیں۔ ہم اپنا خون پی کر کبھی ایک جگہ جا اُچھلتے ہیں تو کبھی دوسری جگہ

جا کودتے ہیں۔ وہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر محظوظ تو ہوتے ہوں گے۔"(44)

ساجد خان کے متعدد افسانے سیاسی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جن میں ایک افسانہ "مسکراہٹ" سب سے بہترین مثال ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک ایسے سیاسی لیڈر کی زبانی بیان کی ہے جو بظاہر تو شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے مگر حقیقت میں وہ ایسا وحشی درندہ ہے جو ہوس کا پُجاری اور جسمانی سکون حاصل کرنے کے لیے معصوم لڑکی کو نوکری کی لالچ دے کر اس کی عصمت پر ڈاکے ڈال رہا ہے۔ مگر یہ متوسط طبقے کی صنف نازک اپنی غربت وافلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی زندگی داؤ پر لگا لیتی ہے۔ مصنف نے اس سیاسی لیڈر کی تعریف وتوضیح ان الفاظ میں کی ہے:

"ملک سردار خان ایک منجھا ہو سیاستدان ہی نہ تھا بلکہ ایک اعلیٰ نفسیات دان اور چہرہ شناس بھی تھا۔ وہ ہر طرح کے ماحول میں فوراً ہی خود کو ڈھال لیتا۔ لفظوں کی جادوگری اور جملوں کی ادائیگی کا فن خوب جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ محلے کے کونسلر سے بڑھتا بڑھتا آج صوبے کا وزیر بن چکا تھا۔ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا کر مقاصد کی تکمیل اُس کا نصب العین تھا۔"(45)

ہمارے آج کے سیاست دان محض اپنی زبان اور لب ولہجے کے سبب عوام کے دل جیت لیتے ہیں۔ خیالی پلاؤ بناتے ہیں اور عوام میں جزبہ ابھارنے کے لیے انہیں وہ باتیں سناتے ہیں جو ان کے بنیادی مسائل میں شمار ہیں۔ جن میں تعلیم نظام کی ابتری، اسکولوں کی حالت زار، پانی کی فراہمی، شہر میں بجلی کی بندش کے خاتمے، سڑکوں کی ناگفتہ بہ حالت جیسے مسائل سرِفہرست ہیں۔ ان مسائل کے بیان کے بعد ایک تعلیم یافتہ لڑکی یہ سوچتی ہے کہ یہ نمائندے اتنے بڑے بڑے کام کرتے ہیں تو پھر اس کی نوکری تو

ان کے لیے بہت آسان کام ہے۔ اسی سلسلے میں جب وہ سیاسی لیڈر سے ملاقات کی خواہش مند ہوتی ہے تو اسے اکیلے میں ملاقات کرنے کو کہا جاتا ہے اور پھر اسے نوکری بھی مل جاتی ہے۔

یہ ہمارا سیاسی نظام جو صرف دکھلاوا ہے۔ اس کے بغیر یہ کچھ نہیں۔ سیاست دان بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو کر اپنا اپنا مطلب نکال رہے ہیں اور بعض عہدے دار غریب عوام کا حق مارتے ہیں اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ جو ظلم و جبر اور بربریت کے سوا کچھ نہیں۔

افسانہ نگار نے ایسے لیڈروں پر بھی طنز کیا ہے جو اپنی جیت اور مفاد کے لیے ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ یہ وہ لیڈر ہیں جو چھپ چھپا کر لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں اور اپنے جیبوں سے رقم کی ادائیگی کرتے ہیں۔ مگر عوام میں جب شعور اور فہم آجاتا ہے تو وہ ان لیڈروں کو جوتے کی نوک پر رکھ کر ان کو سیاست سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ساجد خان یوں رقم طراز ہیں:

> "چھوٹے خان کے گرد وہ لوگ جمع تھے جو مفاد پرست اور موقع شناس تھے۔ جنہوں نے ذاتی کام کروائے اور اپنی جیبوں کو بھرا۔ جب چھوٹا خان ان سے پوچھتا تو وہ سب اچھا کی رپورٹ دیتے۔ حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے چھوٹے خان کے نام پر لوگوں کی زمینوں پر قبضے کیے، بھتے لیے، اپنے کئی رشتہ داروں کے حق چھینے۔ بھلا ان کے کہنے پر ووٹ کون دیتا۔"(46)

علاوہ ازیں افسانہ نگار نے نہ صرف سیاست دانوں کی سیاست اور چالاکی کو ہی بیان کیا ہے بلکہ ساتھ ساتھ ایسے سیاسی نمائندوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو بظاہر تو بڑے عہدے دار اور سرمایہ دار ہیں۔ مگر اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ جب جی میں آیا کام کر دیا اور جب جی چاہا ہاں میں ہاں ملایا۔ اسی وجہ سے افسانہ

نگار نے ایک افسانہ "جب اُن کا جی چاہے گا" کا عنوان بھی اسی صورت میں تخلیق کیا۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے سیاسی لیڈروں اور عہدے داروں کا تذکرہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "اس ملک میں ہر شخص معیار میں پھنسا ہوا ہے دیکھو نا! آج بھی میری فائل پہ دستخط نہیں ہوا۔" دفتر میں نچلے درجے کے ملازم نے اپنے ساتھی سے کہا۔ بھائی جان! دستخط اس وقت ہو گا جب ان کا جی چاہے گا۔ میں نے فائل مکمل کر کے دو دن قبل ہی اُن کی میز پر رکھ دی تھی اب وہ چیک کر کے دستخط کر دیں گے۔"(47)

ساجد خان نے سیاسی عہدے داروں اور افسروں کی حقیقت کو بھی اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے جن کے کردار سے تو ہر کوئی واقفیت نہیں رکھتا بلکہ ان کی گفتگو اور صوفیانہ لہجے پر عوام اعتبار کرتی ہے اور اپنا سب کچھ مانتی ہے۔ در حقیقت یہ وہ وحشی درندے ہیں جو پس پردہ عوام کا لہو پیتے ہیں اور سماج کی تعمیر و ترقی میں رکاوٹ کا ذریعہ بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ساجد خان نے ایک جھلک دیکھائی ہے۔

> "انسان کی قیمت مقرر کر دی گئی تھی، لوگ سماجی اداروں اور فلاحی مراکز کے باہر شور مچا رہے تھے۔ وہ اپنے پیاروں کی تصاویر اٹھائے ہوئے تھے، ایک بڑا افسر جس کے کردار کا سب کو علم تھا۔ ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر قرآن آیت اور احادیث سنائے جا رہا تھا۔ جس کا مفہوم تھا "صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" سامنے کھڑے لوگوں میں سے ایک گویا ہوا" کیا یہ وہی ہے"۔؟(48)

الغرض ساجد خان کی تحریریں کسی ایسے موضوع سے عاری نہیں جو سماج اور اس سے جڑے حالات وواقعات پر مبنی ہیں۔ یہ واقعات چاہے غربت وافلاس کے ہوں، معاشی، سیاسی وسماجی استحصال کے ہوں یا پھر رومانیت اور تانیثیت کے ہوں، جذبات نگاری سے کام لیتے ہوئے حقیقت پسندی کا دامن پکڑے تحریر کرتے جاتے ہیں۔ وہ اس دور کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ کیونکہ وہ ایسے موضوعات تخلیق کرتے ہیں جن کی بظاہر کوئی قدر وقیمت نظر نہیں آتی لیکن جب یہی عنوان وہ تحریر میں لاتے ہیں تو اس کی قدر واہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ساجد خان ان موضوعات کو اس باریک بینی سے لکھتے ہیں کہ روایتی مضامین ہونے کے باوجود بھی نت نئے اور الگ ومنفرد معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایسے اخلاقی مضامین بھی کارفرما نظر آتے ہیں جو ملک وقوم اور معاشرے کی فلاح وبہود کے لیے ممدومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

8۔ادبی پہلو:

ساجد خان کے افسانوی مجموعات "مجھے روشنی چاہیے" اور "دائرے کا اسیر" دونوں میں ادبی پہلوؤں کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ چونکہ ادیب کا یہ کمال ہوتا ہے کہ اس کے قلم سے ٹپکی لہو کی بوند بونہ فلسفیانہ گفتگو کا درجہ رکھتی ہے۔ ادیب معاشرے کا وہ فرد واحد ہوتا ہے جس کی وسعت نظر اور مشاہدہ دیگر افراد سے منفرد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ فن کاری سے فن پاروں کو اس قدر مشاطگی اور جلا بخشتا ہے کہ مطالعہ کرنے والے پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ وہ اپنے فن پاروں میں فکری رجحانات کو اس قدر ادبی رنگ میں رنگتے ہیں کہ جو نہ صرف زبان وادب میں ترقی کا باعث بنتے ہیں بلکہ مستقبل کے لیے اپنی نت نئی راہوں کا تعین بھی کرتے ہیں۔ اسی ادبی روایت کو ساجد خان نے آگے بڑھایا۔ انہوں نے انسانی مسائل کو اسی حقیقت نگاری سے پیش کیا ہے جس طرح ادیب کرتا ہے۔ ان کے ادبی پہلو کا

اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ شعور وادراک رکھتے ہوئے زندہ دلوں کی باتیں زندہ انسانوں سے کرتے ہیں۔ ان کے مشاہدے میں گہرائی کے ساتھ ساتھ گہرائی

کا گہرا عمل دخل ہے۔ اس حوالے سے ہزارہ کے معروف محقق بشیر احمد سوزؔ "ہزارہ میں اردو زبان وادب کی تاریخ" میں یوں گویا ہیں:

"ساجد خان زمینی حقائق اور انسانی مسائل کا نمائندہ قلم کار ہے۔ وہ زندہ دلوں کی باتیں زندہ لوگوں سے کرتا ہے جن میں درد و کرب بھی ہے اور رجائیت کے عناصر بھی موجود ہیں۔ اس کی کہانیوں میں زندگی کے تجربات بولتے نظر آتے ہیں۔ اس کی کہانیاں پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ اطراف کے جھونپڑوں اور گھروندوں کے کواڑوں میں جھانک جھانک کر انسانوں کے تلخ و شیریں واقعات کو اپنی آنکھوں سے بھر لیتا ہے اور پھر انہیں نہایت چابکدستی اور پرکاری کے ساتھ نوکِ قلم سے اوراق پر بکھیر دیتا ہے گویا مشاہدے کی گہرائی اور گہرائی اس کی کہانیوں کا اصل سرمایہ ہے۔"(49)

کسی بھی فنکار کی تحریروں کا اندازہ اس کے اسلوب وزبان سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس طرح مضامین کو برتتا ہے اور ادبی رنگ میں رنگتا ہے۔ ساجد خان کے تمام افسانے ادبی پہلو میں سموئے ہوئے ہیں۔ ان کا اسلوب انتہائی سادہ اور رواں ہے۔ معاشرے کا ہر فرد ان کی زبان وادب کی سلاست کے باعث بآسانی اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی چند ادبی اور فلسفیانہ تحریروں کو بطور نمونہ پیش کیا جارہا ہے کہ وہ کس طرح ہر موضوع کو ادبی خلعت بخشتے ہیں:

"مجلس میں صاحبان علم و فراست جلوہ افروز تھے۔ ان کی ذہانت اور علمی و قار ان کے چہروں کی بشاشت اور سکون سے عیاں تھا۔ نپے تُلے الفاظ اور فصیح و بلیغ جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ مگر یہ مسئلہ کسی جانب سے ایک رائے آتے ہی مزید الجھاؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ ان میں کئی ایسے صاحبان فکر و نظر تھے جنہوں نے علم وادب کی معتبر، ضخیم اور اہم ترین کتب کھنگال رکھی تھیں۔ مشرق و مغرب کے علوم سے بہرہ مند تھے۔"(50)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ساجد خان لکھنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں اور ادبی و فلسفیانہ گفتگو کرنے پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا ہر افسانہ اور افسانے میں موجود تحریریں کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ اور زبان میں مٹھاس لاتی ہیں۔ اسی طرح ایک اور جگہ یوں ادبی گفتگو کرتے ہیں:

"یہ کون ہے؟؟ میں نے روشن جسم سے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ کرخت اور قدرے رعب دار آواز میں کہنے لگا۔ تم نے صرف ایک نقطے میں ساری زندگی گزاری تھی۔ اس نقطے کی زندگی نے آج تمہیں دائرے میں ذلیل و رسوا کر دیا۔ وہ وقت جس کی پاداش میں آج تم ٹھوکریں کھا رہے ہو۔ صرف ایک ساعت تھی تم اس ساعت کے امتحان میں پیچھے رہ گئے ہو۔"(51)

اسی طرح ایک اور اقتباس جو ان کی ادبی گفتگو اور معیار کی بہترین مثال ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"جس عورت کو رب ذوالجلال نے حسن کا جلال اور الفاظ کا استعمال عطا کر رکھا ہو جس کو آنکھوں سے چھو کر دل میں اتارا جائے۔ جو اپنی ایک ایک ادا میں کئی باب رکھتی ہو۔ ایسے شاہکار پر لکھتے ہوئے الفاظ ذہن سے ماؤف اور سیاہی بخارات بن کر زائل ہو ہی جاتی ہے۔ وہ ایک گلاب تھی جس کی ایک ایک پتی میں کئی رنگ سمائے ہوئے تھے ہر پتی اپنے اوپر اظہار چاہتی تھی۔ اُس کا حسن صرف اس کی سیاہ گہری زلفوں میں ہی نہ تھا بلکہ ان زلفوں میں گھرے گول چہرے میں بھی تھا جو ناز کی وہ معصومیت سے لبریز تھا۔"(52)

ساجد خان کے افسانوں میں موضوعات کی جدت ہے۔ اگرچہ روایتی مضامین بھی ان کے ہاں نمایاں ہیں مگر ان موضوعات کو وہ اسی طرح ادبی رنگ دیتے ہیں کہ جو عام ہونے کے باوجود بھی نئے معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی سے جڑے ہر مسئلے اور بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کو انسان بہت کم ہی اہمیت دیتا ہے اور پاؤں تلے روندھ جاتا ہے۔ مگر انہوں نے ان موضوعات کو اس سلیقہ سے برتا ہے کہ قارئین پر نہ صرف اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ ان کی حقیقت سے بھی روشناس کرواتے ہیں۔ جیسے:

"یہ کون ہے؟؟ میں نے روشن جسم سے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ کرخت اور قدرے رعب دار آواز میں کہنے لگا۔ تم نے صرف ایک نقطے میں ساری زندگی گزاری تھی۔ اس نقطے کی زندگی نے آج تمہیں دائرے میں ذلیل ورسوا کر دیا۔ وہ وقت جس کی پاداش میں

آج تم ٹھوکریں کھا رہے ہو۔ صرف ایک ساعت تھی تم اس ساعت کے امتحان میں پیچھے رہ گئے ہو۔"[51]

اسی طرح ایک اور اقتباس جو ان کی ادبی گفتگو اور معیار کی بہترین مثال ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"جس عورت کو رب ذوالجلال نے حسن کا جلال اور الفاظ کا استعمال عطا کر رکھا ہو جس کو آنکھوں سے چھو کر دل میں اتارا جائے۔ جو اپنی ایک ایک ادا میں کئی باب رکھتی ہو۔ ایسے شاہکار پر لکھتے ہوئے الفاظ ذہن سے ماؤف اور سیاہی بخارات بن کر زائل ہو ہی جاتی ہے۔ وہ ایک گلاب تھی جس کی ایک ایک پتی میں کئی رنگ سمائے ہوئے تھے ہر پتی اپنے اوپر اظہار چاہتی تھی۔ اُس کا حسن صرف اس کی سیاہ گہری زلفوں میں ہی نہ تھا بلکہ ان زلفوں میں گرے گول چہرے میں بھی تھا جو ناز کی وہ معصومیت سے لبریز تھا۔"[52]

ساجد خان کے افسانوں میں موضوعات کی جدت ہے۔ اگرچہ روایتی مضامین بھی ان کے ہاں نمایاں ہیں مگر ان موضوعات کو وہ اس طرح ادبی رنگ دیتے ہیں کہ جو عام ہونے کے باوجود بھی نئے معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی سے جڑے ہر مسئلے اور بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کو انسان بہت کم ہی اہمیت دیتا ہے اور پاؤں تلے روندھ جاتا ہے۔ مگر انہوں نے ان موضوعات کو اس سلیقہ سے برتا ہے کہ قارئین پر نہ صرف اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ ان کی حقیقت سے بھی روشناس کرواتے ہیں۔ جیسے:

"تدفین کی تیاریاں شروع تھیں۔ میری ٹانگیں اور بازو درست کیے جارہے تھے۔ میرے ہونٹوں اور آنکھوں پر کسی نے نرم گرم ہاتھ

پھیرے۔ انگلیاں سیدھی کیں گئیں۔ مجھے غسل دیا جانے لگا۔ کفن پہنا کر خوشبوئیں چھڑ کی گئیں۔۔۔۔۔ میری نمازِ جنازہ ادا کی گئی ۔۔۔۔۔ مٹی مٹھیاں بھر بھر ڈالی گئی۔ عطر کا چھڑ کاؤ ہوا، میرے بیٹے نے قبر پہ پھول پتیاں ڈالیں۔ پھر آہستہ آہستہ سب چلتے بنے۔"(53)

ساجد خان کی یہ فلسفیانہ گفتگو اور صوفیانہ مزاج ان کے ادبی پہلو کی پہچان ہے۔ وہ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں، جس موضوع کو بھی تخلیق کرتے ہیں اسے ادبی دائرے کے اندر پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں اور ان کا اسلوب عصر حاضر کے تمام لکھاریوں سے منفرد اور الگ ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر کاشف بٹ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"ساجد خان ایک قابل ذکر افسانہ نویس ہیں جن کے افسانے اور کہانیاں پاکستانی معاشرے اور ثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے انسانیت کے جوہر سے گونجتے ہیں۔ رشتوں کی پیچیدگیوں تصوف کے پراسرار دائروں اور خود شناسی کے گہرے سفر کو تلاش کرتی کہانیاں ساجد خان کا تخصص ہیں۔ ساجد خان کا ادبی کینوس عام افراد کی زندگیوں کے درمیان کھیلتا ہے۔ وہ عام آدمی کے جوہر اس کی انتھک جدوجہد، کمزوریوں اور کارگزاہوں کو موضوع کرتے ہیں۔ جہاں وہ پاکستانی معاشرے کی کثیر جہتی فطرت اور اس کی روایات اقدار اور رسم سے اپنے افسانوں کو رنگین کرتے ہیں۔ وہیں اُن کی کہانی ایک طاقتور آئینہ کا کام بھی کرتی ہے۔ وہ نہ صرف

> معاشرے میں پھیلی تفریق اور عدم برداشت کو افسانہ کا موضوع بناتے ہیں بلکہ انسانی تجربے کی گہرائیوں اور نتیجے میں رونما ہونے والے ردعمل کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔"(54)

مختصر یہ کہ ساجد خان کے افسانے کسی ایک موضوع یا مسئلے کو بیان نہیں کرتے بلکہ ہر افسانے کا موضوع دوسرے افسانے سے مختلف و منفرد ہے۔ ان کی تصانیف میں فکری رجحانات کی رنگارنگی ہے۔ بیان کرنے کا انداز بے تکلفانہ ہے۔ ان کی کہانیاں کسی ایک انسان کے لیے یا کسی ایک معاشرے کے لیے نہیں ہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کے لیے ایک اہم پیغام اور تحفہ ہیں۔ بعض اوقات قاری یہ سمجھتا ہے کہ وہ بھی ان افسانوں کا حصہ ہیں اور یہ کہانیاں انہی کے متعلق برتی گئی ہیں۔

ساجد خان کے افسانوں میں جذباتی پہلو، معاشی مسائل، رومانیت، نفسیاتی پہلو، سماجی مسائل، تانیثیت، سیاسی پہلو اور ادبی پہلو ایسے اہم اور چیدہ چیدہ فکری عناصر تھے جن کا تذکرہ ضروری اور اہم تھا۔ علاوہ ازیں ان کے افسانوں میں دیگر ایسے موضوعات بھی ہیں جو دورِ حاضر کے تقاضوں پر پورا اترتے ہیں۔ سماج اور معاشرے سے جڑے حالات وواقعات کا وسعت نظری سے مطالعہ کرتے ہیں اور بغیر کسی لگی لپٹی کے صفحہ قرطاس پر مرتسم کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی انفرادیت اس وجہ سے برقرار ہے کہ وہ موضوعات کو اسی حقیقت نگاری سے بیان کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں جس طرح وہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کے عام فرد سے لے کر خاص فرد، جاندار، پرندے اور دیگر بے جان اشیا کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور عوام میں عصری شعور رچانے کی ہر ممکن کوشش کے قائل ہیں۔

حوالہ جات

1. ڈاکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، 2018ء، ص92
2. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، فرینڈز پبلشرز، راولپنڈی، 2011ء، ص94
3. ایضاً، ص95
4. ایضاً، ص67
5. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص67
6. ساجد خان، دائرے کا اسیر، سلطان پبلشرز، راولپنڈی، 2014ء، ص66
7. ایضاً، ص68
8. ایضاً، ص19
9. ایضاً، ص20
10. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص49
11. ایضاً، ص50 تا 51
12. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص 41
13. ایضاً، ص49
14. ایضاً، ص56
15. ڈاکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ایضاً، ص129
16. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص123
17. ایضاً، ص125

18. ایضاً، ص82

19. ایضاً، ص90

20. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص100

21. ایضاً، ص101

22. ڈاکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ایضاً، ص270

23. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص50

24. ایضاً، ص52

25. ایضاً، ص33

26. ڈاکٹر ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ایضاً، ص165

27. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص68

28. ایضاً، ص68

29. ایضاً، ص70 تا 71

30. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص103

31. ایضاً، ص104

32. ایضاً، ص61 تا 62

33. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص127

34. ایضاً، ص127

35. ایضاً، ص127

36. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص29

37. ایضاً، ص56

38. ایضاً، ص72

39. ایضاً، ص75 تا76

40. ایضاً، ص62

41. ایضاً، ص63

42. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص73

43. ایضاً، ص74

44. ایضاً، ص60

45. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص125

46. ایضاً، ص124

47. ایضاً، ص84

48. ایضاً، ص85

49. پروفیسر بشیر احمد سوز، ہزارہ میں اردو زبان وادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ، مرکز تحقیق واشاعت، 2012ء، ص28

50. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص7

51. ایضاً، ص24

52. ایضاً، ص112

53. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص116

54. ڈاکٹر کاشف بٹ، انٹرویو، بذریعہ ٹیلی فون، 31 مئی 2023

باب سوم:

ساجد خان کے افسانوں کا فنی مطالعہ

کوئی بھی فن کار اپنے فن پاروں کو اس طرح تحریر میں لاتا ہے کہ جو نہ صرف ادب کا حصہ بنتے ہیں۔ بلکہ ان فن پاروں میں وہ رعنائی اور دلکشی ہوتی ہے کہ اس کا اثر معاشرے کے ہر فرد پر براہ راست ہوتا ہے۔ تحقیق کار اپنے ارد گرد رونما ہونے والے حالات وواقعات کو مختلف فنی مراحل سے گزارتا ہے۔ جس میں قارئین کی دلچسپی رونما ہوتی ہے۔ یہ محض اظہار کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ تخلیق کار کے حسنِ اظہار کی یہ شعوری کوشش ہوتی ہے۔ جس بنا پر وہ اپنی تحریروں کو زندگی یا اس کی حقیقت کو مسرت بخشے۔ فن کے متعلق ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں۔

"زندگی یا حقیقت کی ایسی عکاسی یا ترجمانی جو مسرت بخشی پر منتج ہو۔ صرف اظہار پر اکتفا کرنے کی بجائے حسن اظہار کی شعوری کوشش ہو۔

(1) فنکار کی اپنی شخصیت کا پر تو جس میں اس کا سماجی شعور بنیادی اہمیت رکھتا ہے"

کسی بھی فن پارے کا یہ جمالیاتی پہلو بنیادی اور مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ جس میں ادیب مختلف فنی عناصر کو اپنی تحریروں میں بروئے کار لاتا ہے۔ اگرچہ فکری پہلو یا رجحانات اپنی اصلیت اور موضوع کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ جبکہ فنی عناصر اس کی خوبصورتی کا باعث بنتے ہیں۔ فکری عناصر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ فن کار نے اپنی تحریروں میں کن موضوعات وعنوانات کو برتا ہے جب کہ فنی پہلو انہی موضوعات کے متعلق یہ علم دیتے ہیں کہ یہ کس انداز میں استعمال کر کے ان میں حسن وجمال کو تقویت بخشی ہے۔ جو عوم کے اندر دلچسپی اور مسرت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

اردو زبان وادب کی تاریخ میں ابتدا سے عصرِ حاضر تک کے تمام شعرا وادباء نے اپنی تحریروں میں فکری وفنی عناصر کو اس انداز سے پیش کیا کہ جو نہ صرف ادب عالیہ کا حصہ بنے، بلکہ عوام الناس کے

لیے اخلاقی اقدار و روایات کو محور بنایا۔ آج کے جدید دور کے تمام لکھنے والوں نے اس روایت کو بر قرار رکھنے کے ساتھ ساتھ نت نئے موضوعات کو صفحہ ء قرطاس پر اس قدر فنی مہارتوں سے پیش کیا جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جدید لکھنے والوں میں ایک اہم نام ساجد خان کا بھی ہے۔ جو بطور افسانہ نگار ہزارہ کی سر سبز و شاداب سر زمین سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کا ہر افسانہ اور کہانی تمام تر فنی عناصر کی پابند ہے۔ اپنے ارد گرد کے تمام حالات و اقعات، مسائل، عدم مساوات اور دیگر حوادث کو اسی طرح فن کے قالب میں ڈھالتے ہیں کہ معاشرے کا ہر فرد مسرت بھی حاصل کرتا ہے اور ان کے حل کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنی کہانی کو مکمل طور پر فنی پہلوؤں سے آگے بڑھاتے ہیں اور ان سے متعلق تمام لازم اجزاء کو استعمال کرتے ہیں۔ ساجد خان کا فن نہایت سادہ اور شگفتہ ہے۔ ان کے فن کے متعلق مشہور و معروف نقاد محمد بشیر رانجھا یوں رقم طراز ہیں۔

> "ساجد خان کا فن نہ تو جذبات وافکار کی پیچیدہ اکائیوں سے مرتب ہونے والا کوئی حل شدہ ریاضیاتی فارمولا ہے، نہ ہی کوئی امتحان پاس کرنے کے لیے گٹ تھرو گائیڈ اور نہ ہی اس کا تعلق دائیں بائیں کی منشوریاتی راہ عمل سے ہے۔ ساجد خان اپنے بہت سے ہم عصر افسانہ نویسوں کی مانند سستی جذباتیت، نرم و ملائم اظہاریت، جنسی نشاطیت اور جسمانی مقناطیسیت کے حربوں سے کام لینے کو معیوب جانتا ہے اور مستی شہرت حاصل کر کے ٹیبل ٹاک بننا اس کا مسئلہ ہر گز نہیں"(2)

ساجد خان کی افسانہ نگاری تمام تر فنی پہلوؤں کے گرد گھومتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اختصار، اسلوب کی سادگی، وحدت تاثر، خیال آفرینی یہاں تک کہ ان کی جزائیات نگاری بھی مناسب صورت میں برتی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عمر علی دائم یوں گویا ہیں:

"ایک اچھے افسانے کے لیے اختصار، اسلوب، وحدت تاثر، خیال آفرینی، کرداروں کا آپس میں ربط و آہنگ، وحدت زماں اور جزئیات نگاری کی ن مناسبت کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اور یہ تمام خوبیاں اللہ تعالیٰ نے ساجد خان کو بدرجہ اتم عطا کی ہیں" (3)

انسان فطری طور پر فطرت پسند ہے۔ وہ قدرت کے بنائے ہوئے نظام کائنات کو عمیق نظری سے دیکھتا ہے اور تعریف و تحسین کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ساجد خان بھی وہ فردِ واحد ہیں جو اپنے ارد گرد کے حالت و واقعات کا گہرا مشاہدہ کر کے، سماج کے دکھ درد واہم اور غم و خوشی کو اپنا موضوعِ فن بنا لیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی تحریر میں بہت سے قدرتی اور حسین مناظر کو بھی رقم کرتے ہیں جس کے سبب ان کے فن میں مزید نکھار پیدا ہوتا ہے اور کہانی کہتے جاتے ہیں جس سے قارئین ایک لمحے کے لیے بھی اکتاہٹ کا شکات نہیں ہوتا بلکہ دلچسپی کے عناصر فراہم ہوتے ہیں۔ ساجد خان حساس طبیعت کے مالک ہیں اور یہی حساسیت ان کے افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ فنی عناصر کی پابندی اور ان عناصر کے مداخلت کی وجہ سے تحریر کو دوام ملتا ہے۔ جس کا تذکرہ ذیل میں مختصر پر جامع انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔

1۔زبان و بیان:

ادیب یا شاعر کی طرزِ نگارش، لب و لہجہ اور اسلوب بیان ان کے فن پاروں کو جلا بخشتے ہیں۔ یہ وہ فنی پہلو ہے جس سے با آسانی کسی فنکار کے فن پارے سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہر دور و زمانے کے لکھاریوں نے اپنے لیے الگ اسلوب اور زبان و بیان کو اختیار کیا۔ جس کے سبب قارئین اس انفرادیت سے مکمل طور پر آشنا ہو جاتے ہیں۔

جدید دور کے لکھنے والوں میں ایک نام ساجد خان کا ہے جن کی تحریر اور انداز بیان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ انہوں نے جس اسلوب کو اپنی تحریروں میں بنیادی وجہ بنایا ہے اور جس کی وجہ سے وہ دوسرے ہم عصروں سے منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا اسلوب ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب فنکار و کا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ الگ شاخت رکھتا ہے۔ اپنے جذبات و تخیلات کو عام اور سادہ انداز میں مرتسم کرتا ہے۔ اسی لیے ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> "اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ، ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا ڈھنگ ہے، جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے شمول سے وجود میں آتا ہے اور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفہء حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کو صنف شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے"(4)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ساجد خان کی تحریریں ان کے منفرد اسلوب اور طرز بیان کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کا انداز جس قدر سادہ اور سلیس ہے اسی طرح دلکش اور خوبصورت بھی ہے۔ وہ مبہم الفاظ سے گریز کرتے ہیں کہ پیچیدہ الفاظ سے اجتناب کرتے ہوئے، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بات بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو عام انسان بھی با آسانی پڑھ کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ بغیر کسی اکتاہٹ کے ہر فرد ان کے افسانوں کو دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا انداز بیان اور اسلوبِ بیان ہے جس کے متعلق عادل قریشی یوں رقم طراز ہیں:

"ساجد خان کے ہاں سلاستِ صفتِ خاص کے طور پر سامنے آتی ہے۔ زبان کی یہ سلاست ان کے ہاں تازگی اور شگفتگی کو جنم دیتی ہے۔ یہی خوبی، روانی اور ترسیل معنی کو یقینی بناتی ہے۔ فکشن میں ایسی خوبی ادب پارے کی چاشنی اور دلکشی کا سبب بھی بنتی ہے۔"(5)

ساجد خان کے افسانوں میں ان کی طرزِ نگارش اور زبان و بیان کا جو طلسم نمایاں نظر آتا ہے اس کی جھلک درج ذیل اقتباسات میں نمایاں دیکھی جاسکتی ہے۔ جیسے:

"کافی دنوں سے جاری بارش اور شدید سردی کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا محال ہو رہا تھا۔ آج موسم نسبتاً کچھ صاف تھا تو میں چہل قدمی کے لیے گھر سے باہر نکل پڑا۔ گھر واپس لوٹتے ہوئے میں نے اسے گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہی تھی میں نے دانستہ نظریں جھکائیں اور کترا کے آگے نکلنا چاہا۔ تھوڑی دور جا کر

غیر ارادی طور پر میں نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ مجھے ہی تکے جا رہی تھی"(6)

ساجد خان نے اپنے افسانوں میں خوبصورت اور مختصر جملوں کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے غیر ضروری بحث و تکرار سے گریز برتا ہے۔ وہ سادہ اور عام فہم زبان و بیان کا دامن نہیں چھوڑتے اور حسین پیرائے کو اختیار کرتے ہوئے اپنی بات واضح کرتے ہیں۔ ان کے یہ جملے اور حسین پیرائے تخیل اور جذبات کے ساتھ اُن کے فہم و فراست کی گواہی پیش کرتے ہیں۔ جیسے ایک افسانہ میں لکھتے ہیں:

"تم نے صرف ایک نقطے میں ساری زندگی گزار دی تھی، اس نقطے کو زندگی نے آج تمہیں دائرے میں ذلیل ورسوا کر دیا، وہ وقت جس کی پاداش میں آج تم ٹھوکریں کھا رہے ہو۔ صرف ایک ساعت تھی تم اس ساعت کے امتحان میں پیچھے رہ گئے ہو"(7)

پھر افسانہ نگار مزید وقت کے ضیاع پر روشنی ڈالتے ہیں اور ذلیل و خوار ہونے کی وجہ بناتے ہیں اور تذلیل ورسوانہ ہونے کے حل کے لیے کہہ دیتے ہیں:

"تم نے اُس ساعت میں داغ دھونے تھے اور اُن داغوں کی جگہ روشنی نے لینی تھی۔ اچانک قوس قزح سے کہیں زیادہ دلکش رنگ ایک دوسرے میں ملتے ملاتے عجیب منظر پیش کرنے لگے، دھیرے دھیرے مختلف رنگ سفیدی میں بدلتے جارہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہر جانب سفیدی پھیل چکی تھی۔ میس جس طرف بھی دیکھتا

آنکھیں چندھیا دینے والی سفید روشنی تھی، کبھی تو ایسے لگتا کہ ہر
جانب آئینے ہیں، جو روشنی کو منعکس کر رہے ہیں"(8)

مندرجہ بالا جملے ساجد خان کے افسانوں میں جہاں زیب و زینت اختیار کر چکے ہیں وہاں یہ جملے لفظ ذی شعور ہونے کی گواہی بھی دیتے ہیں۔ ان کی زبان و بیان میں تراکیب سازی، خوبصورت تلازمے اور تکرارِ حرفی و لفظی فصیح و بلیغ جملوں پر مختصر ہے۔ وہ محل کے مطابق الفاظ کو ناپ تول کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ماہر معمار کی طرح لفظوں کو لفظوں کے ساتھ ایسے ملاتے ہیں جیسے در و دیوار میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو۔ ان کے اسلوب اور طرز نگارش میں ایک خاص قسم کا طلسم ہے جو قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔ ان کی زبان و بیان میں اسلوب کی تازہ کاری شائستگی اور شگفتگی کے عناصر موجود ہیں۔ انہی عناصر کی بدولت انکے جملوں میں ایک تاثر پایا جاتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور عمدہ اسلوب کی بدولت وہ حقیقت کو سامنے لاتے ہیں۔ افسانہ نگار کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں کوئی ایسی نئی بات پیش کر دیتے ہیں جو اپنی الگ اور منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ یہی ان کا فن ہے جو ان کے جذبات کی آمیزش ہے کہانی کا دوام ملتا ہے۔ درج ذیل اقتباس ان کے انداز بیان اور طرزِ نگارش کی بہترین مثال ہے۔ جیسا:

"اخبار میں بھرتی کا بڑا اشتہار سارے ڈگری ہولڈرز بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ درخواست دینے والوں کے لیے درخواست کے ساتھ دو ہزار روپے بھی جمع کروانے ضروری تھے۔ طیب نے بھی درخواست بھیجی تھی۔ درخواستیں ارسال کرنے والے کئی خواب بننے لگے۔ سب اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے بے چین تھے۔ امیدواروں کے چہرے خوشی سے کھلے جا رہے تھے"(9)

اسی طرح افسانہ نگار نے اس نئے موضوع کو اپنے فن کے قالب میں ڈھال کر ان تعلیم یافتہ طبقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اپنے عہدے اور منصب کی بدولت نو مولود اور نوجوان طبقے کو آگے بڑھتے سے روکتے ہیں اور رشت اور اقرباوری کے باعث معاشرے میں انتشار اور افرا تفری کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ یہی افسانہ نگار کا فن ہے کہ وہ حقیقتوں سے ہمیں روشناس کراتے ہیں اور پھر اس کشمکش کو یوں بیان کر دیتے ہیں۔

> "ہر انٹر ویو دینے والا یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہنستا مسکراتا دل میں نوکری مل جانے کی امید بسائے ہال سے باہر نکل جاتا۔ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اِنٹرویو کے بعد کاغذات کی چھان بین اور دیگر مراحل کے مکمل ہونے اور نتائج مرتب کرنے میں تین ماہ کی مدت کا بھی اعلان کیا گیا۔ انٹر ویو دینے کے بعد جب سال بھر کسی بھی امیدوار کو کوئی اطلاع نہ دی گئی تو یہ افواہ بھی گردش کرنے لگی کہ تمام ملازمتوں پر تعیناتی انٹر ویو سے ایک دن قبل ہی ہو گئی تھی۔ بعد کاڈرامہ تو محض لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے رچایا گیا تھا"(10)

ساجد خان کی زبان وبیان میں ایک اثر پایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کا الفاظ کا چناؤ بہترین ہے۔ جس کے سبب ان کے افسانوں میں جمالیاتی عناصر کی بھرمار ہے یہی حسن وجمال ان کی تحریر میں چاشنی پیدا کرتا ہے اور قارئین کو خاص فضا اور ماحول فراہم کرتے ہیں۔ ان کی لفضیات کا توازن اور بر محل الفاظ کا استعمال، زبان وبیان کا بنیادی وصف ہے۔ شاعری اور نثر میں یہی خوبی پڑھنے والوں پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ افسانے میں چاشنی اور شیرین لفظ کی ایماندرانہ

ڈھونڈ اور بلیغ اس صنف کو وسعت دیتی ہے۔ یہ تمام تر الفاظ ساجد خان کے افسانوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ، پیراگراف اور جملہ ایک ایسے انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والا اکتائے بغیر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ چند افسانوں سے مختلف اقتباسات جو ساجد خان کی زبان وبیان اور اسلوب پر پورا اترتے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

> "طاہر علی کبھی کبھی سوچنے لگتا کہ گاؤں کے لوگ کسی قدر آرام کی زندگی گزارتے ہیں نہ تو ہر وقت چیخ چیخ اور نہ ہی شور شرابا۔ لیکن یہاں کسی کو کوئی کیسے منع کرے اور پھر منع کرے بھی کیوں؟ ایک بار درزی سے کہا کہ جناب کپڑے سینے ہوں تو اپنی دکان کا دروازہ بند کر لیا کریں۔ تمہارا دروازہ ویسے بھی شیشے کا ہے۔ اندر بیٹھے نظر تو آتے ہو تو اس نے ایک ہی جواب دیا کہ میں کرایہ دیتا ہوں جو جی میں آئے گا کروں گا، آپ اپنی راہ لیں" (11)

اسی طرح ایک اور مقام پر الفاظ کا انتخاب دیکھیں جس سے قاری نہ صرف مسرت حاصل کرتا ہے بلکہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے:

> "وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا چاند کو دیکھ رہا تھا لیکن اُس کا ذہن کہیں اور تھا۔ زندگی کتنی جلدی گزر گئی ہے۔ اُسے اپنا بچپن، بچپن کے دوست اور بچپن کی شرارتیں یاد آنے لگیں۔ اُس کی سرخ آنکھیں چاند پر ٹکی تھیں۔ وہ آسمان کی وسعتوں اور وسعتوں میں جگ مگ کرتے ستاروں کو دیکھنے لگا۔ پھر گویا ہوا "نجانے کتنی ہی دنیائیں آباد ہیں؟" اُس کے احساسات کی دنیا جاگ اٹھی۔ اُسے اپنے سارے یار

بیلی نظروں کے سامنے گھومتے نظر آنے لگے۔ جن میں سے کئی
آخرت کے سفر پہ جاچکے تھے۔"(12)

ساجد خان زبان و بیان پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور معاشی مسائل کو جس طرح انہوں نے فنی نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ وہ یقیناً قابلِ غور ہے۔ جیسے:

"سردی سے پاؤں کو بچانے کے لیے میں نے لنڈا بازار سے کئی جوڑے جرابیں تو لے لیں اور دو دو تین تین جوڑے اوپر تلے پہن کر جوتوں کی کمی کو پورا کرتا رہا مگر وہ جرابیں بھی تو پرانی ہی ہوتیں۔ جب لوگوں کی دعاؤں کے بعد بارش ہو جاتی تو میرے لیے کئی مسائل کھڑے ہو جاتے اور برسات کے دن تو میرے لیے کسی اذیت سے کم نہ ہوتے۔ کئی سال پہلے یہ جوتے میں نے اپنے ایک جاننے والے کی دکان سے خریدے تھے۔ جوتے خریدنے سے پہلے کتنی ہی بار میں نے اُسے اپنی لچھے دار باتوں میں الجھائے رکھا اور سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے مہنگائی اور معاشی مسائل پر لمبی جوڑی تقریر بھی سنائی"(13)

مختصر یہ کہ ساجد خان کی تحریریں گہرے مشاہدات کے بعد واقعات کے جذبات کو پیش کرتی ہیں۔ جس کے سبب ان کی کہانی میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ خطیبانہ انداز بیان بھی واضح نظر آتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کرتے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی اور سماج کے مسائل کو وہ فن کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ اس لیے ان کے افسانے کی زبان و بیان اور

لب ولہجہ ہر کس وناکس سمجھتا ہے اور تادیر اثرات قائم کرتا ہے۔ جس کو ساجد خان نے اپنے اسلوب اور دلآویزی سے مرتسم کیا ہے۔

2- پلاٹ:

کسی بھی کہانی کا پہلا اور لازمی جزو ہے۔ افسانے یا کہانی کا وہ حصہ ہے جس میں فنکار اُس کہانی کا خاکہ یا ڈھانچہ تخلیق کرتا ہے۔ پلاٹ بنیادی طور پر واقعات، عروج اور اختتام پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی ترتیب کا نام پلاٹ ہے۔ بقول رفیع الدین ہاشمی "اصنافِ ادب":

> "افسانے کے لیے پلاٹ بھی ضروری ہے، وقعہ یا (واقعات) کا آغاز وارتقا یا پھر عروج یا منتہا تک پہنچنا اور اس کے بعد ایک موزوں نتیجے پر ختم ہونا اسی ترتیب و تنظیم کا نام پلاٹ ہے۔"(14)

افسانے کا یہ حصہ (پلاٹ) تخلیق کار کے مشاہدات، گردوپیش کے حالات وواقعات، کردار اور نقطہ نظر کو بروئے کار لاتا ہے۔ ایک اچھا پلاٹ کہانی میں نہ صرف دلچسپی پیدا کرتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ آغاز سے انجام تک یہ ڈھانچہ بھی اسی قدر دلچسپ اور مربوطہ ہوتا ہے۔ یہی وہ نقشہ یا خاکہ کے جس پر مصنف کہانی کی عمارت بناتا ہے۔ اگر پلاٹ دلچسپ نہ ہو تو کہانی ناقص اور کمزور ہوتی ہے۔ مضبوط پلاٹ کہانی کو بے ترتیبی اور انتشار سے بچائے رکھتا ہے۔

آج کے جدید افسانہ نگاروں میں ساجد خان کا فن ان کے افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی رویوں اور پامال ہوتی اقدار کو باریکیوں سے پیش کیا۔ ان کے افسانوں میں پلاٹ مضبوط اور بناوٹ سے صاف ہیں۔ اس ضمن میں محمد اسفر آفاقی "سلگتے المیے" میں بیان کرتے ہیں:

"ساجد خان نے اپنے افسانوں اور کہانیوں میں تمام انسانی رویوں اور ان کی باریکیوں کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے افسانوں اور کہانیوں کے پلاٹ بناوٹ یا تصنع سے بالکل پاک صاف نظر آتے ہیں۔ اس نے اپنے تخلیقی عمل میں کسی بھی نا قابلِ فہم یا دوراز کار بات کا سہارا نہیں لیا"(15)

ساجد خان نے اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات کا گہرا مشاہدہ کیا اور اسے ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔ ان کے افسانوں کے موضوعات بلکل مختلف ہیں مگر پلاٹ مضبوط و مربوط ہیں۔ ان کے افسانوں میں پیچیدگی وابہام نہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں کے مضبوط پلاٹ کے باعث بہترین ترتیب عطا کی ہے جو ان کی فنی پختگی کی مکمل دلیل ہے۔

3- کردار نگاری:

افسانے کے بنیادی اجزا میں کردار نگاری اہمیت کی حامل ہے۔ پلاٹ کے ذریعے افسانہ نگار کہانی کو ترتیب دیتا ہے مگر یہ ترتیب کرداروں کے سبب ہی پایہ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں زندہ کرداروں کو پیش کر کے اپنی کہانی کو زندہ بنا دیتا ہے۔ بے جان کردار، بے جان کہانی کی علامت ہیں۔ ایک کامیاب فنکار اپنے معاشرے کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے گوشت پوست کے کرداروں کو اپنی کہانی کا حصہ بناتا ہے۔ جن کی وجہ سے وہ معاشرے میں رونما ہونے والی برائیوں، سیاسی مفاد پرستی، معاشی اور معاشرتی اثرات کو انہی کرداروں کے باعث نقاب کشائی کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ اس متعلق سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

"افسانہ نگار کچھ مخصوص کردار لے کر ان کی مصوری کرنا چاہتا ہے۔اس مقصد کے لیے وہ واقعات اور موقع وضع کر کے کرداروں کا ارتقا دکھاتا ہے یا پھر کوئی واقعہ اس کے سامنے آتا ہے اور اس واقعہ یا موقع کی مناسبت سے کرداروں کو اس میں سمولیتا ہے۔ یا پھر کوئی خاص ماحول یا فضا اسے متاثر کرتی ہے وہ اس ماحول یا فضا کی ترجمانی کے لیے کوئی واقعہ اور اس مواقع پر عمل کرنے والے کردار تراشتا ہے اور ان دونوں چیزوں کی مدد سے اس ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر پیدا کرتا ہے"(16)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ صادر کیا جاسکتا ہے کہ ساجد خان کے افسانے انہی کرداروں پر مشتمل ہیں جو عام زندگی میں چلتے پھرتے اور فطرت کے مطابق ہیں کوئی بھی کردار ایسا نہیں جو مصنف نے اپنی مرضی کے مطابق تخلیق کیا ہو۔ بلکہ تمام کردار ایسے ہیں جو اپنی فطرت سے بھرپور ہیں اور سماج میں رونما ہونے والے منفی اور تبدیل ہوتی روایات کی نمائیدگی کرتے ہیں۔ ساجد خان ان کرداروں کے ذریعے آج کے سماج کی حقیقت سے ہمیں روشناس کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے تمام کردار زندہ اور متحرک ہیں۔ ابہام اور پیچیدگی سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے انسانی زندگی میں پیش آنے والے دکھ درد، غم والم اور مصائب وتکلیف کو بڑی مہارت سے رقم کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند منتخب افسانوں سے کردار پیش کیے جارہے ہیں:

"خلیل احمد گاؤں کے متوسط لوگوں میں شامل تھا۔ سارا گاؤں اسے خلیل ماما کہہ کے پکارتا تھا۔ بیس کنال اراضی تھی جو اس کے بال بچوں کا پیٹ پالنے سے قاصر تھی۔ وہ کثیر العیال آدمی تھا۔ ماما کے

بڑے بیٹے کے بعد تین بیٹیاں کلثوم، فہمیدہ اور رابعہ اور دو چھوٹے
بیٹے علی اور فیضان تھے۔ پورے کنبے کی کفالت اور اخراجات کا بوجھ
آہستہ آہستہ اُس کی استطاعت سے باہر ہوتا جارہا تھا۔" (17)

افسانہ نگار نے اپنے افسانے میں جس کردار کو پیش کیا ہے وہ جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا انسان ہے۔ جس کے ساتھ کئی چھوٹے بڑے ضمنی کردار ہیں۔ جس کے باعث افسانہ نگار نے اپنی کہانی کو آغاز تا انتہا کامیابی سے تخلیق کیا ہے۔ اس افسانہ "آخری اڑان" میں خلیل احمد کے کردار کو اس نسبت سے پیش کیا ہے کہ معاشرے میں جو ناہمواریاں اور بدنظمی جنم لیتی ہے۔ وہ کسی فرد کی دن رات محنت و مزدوری کرنے کے باوجود ضروریات زندگی فراہم نہ کرنے کی وجہ ہے۔ ایک خاندان کے بیش بہا افراد کھانے والے ہوں۔ اور کمائی کرنے والا محض ایک ہو تو پھر اِس فرد کی زندگی میں آرام و سکون باقی نہیں رہتا۔ وہ اپنے اولاد کو گھر سے باہر کام کرنے کی عرض سے نکال دیتا ہے جب کہ اولاد کی فطرت اور منزل کچھ اور ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کردار خلیل احمد بچے کو فوج میں بھرتی کرانا چاہتا ہے لیکن یہ لڑکا مزید تعلیم حاصل کرنے کی ضد میں ملازمت نہیں کرتا اور بلآخر گھر سے فرار ہو جاتا ہے۔ یہی فرار ہونا اس لڑکے کو اور اس کے گھرانے کو یکسر تبدیل کر دیتا ہے، جیسے:

"پہلے خط سے وسیم کے گھر والوں کو یہ خوشخبری ملی کہ وہ زندہ ہے
اور بعد میں روپے، درہم اور پاؤنڈ نے ان کے حالات بھی بدل
ڈالے۔ روپے کی ریل پیل اور بدلے ہوئے حالات میں خلیل ماما
نے اپنی بیٹیوں کو پڑھایا بھی اور ان کے رشتے اچھے خاندانوں میں
کر دیے۔ علی اور فیضان نے ایم اے تک تعلیم بھی حاصل کی اور
کھاتے پیتے گھرانوں میں دونوں کی شادیاں ہوئیں۔" (18)

ساجد خان اپنی کہانی میں ایسے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں جو معاشرے کے عام افراد ہیں۔ وہ کردار جو پیٹ پوجا کی خاطر سختیاں برداشت کرتے ہیں اور آخر کار یہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسے متحرک کردار ہیں جو اپنے گھر بار چھوڑ کر اپنی فکر کیے بغیر محنت مزدوری کر کے باقی خاندان کی زندگی کو بناتے سنوارتے ہیں۔ لیکن آخر میں یہ افراد بذاتِ خود تو راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ جیسے مصنف نے اس کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

"وسیم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور تیزی سے واش روم کی راہ لی۔
جہاں وہ کافی دیر تک تنہائی سے گلے ملے کر روتا رہا۔ وہ جب واش
روم سے باہر آیا تو اس کی آنکھیں سرخ اور رنگ لِکے کبوتر کی طرح
بظاہر بلکل صاف تھا لیکن اس کے اندر کہیں وہ طوفان بھی برپا تھا جو
آخری اُڑان کا پیش خیمہ بنا"(19)

ساجد خان نے ایک اور افسانہ "مکافاتِ عمل" اسی طرز کے کرداروں پر تخلیق کیا ہے جو مطلب پرست اور ہوس پرست ہیں۔ جو عورتوں کی عصمت اور عزت پر ڈاکا ڈالتے ہیں اور ان کی زندگی کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اس افسانے میں مصنف نے ایک ایسے کردار کو منظر عام پر لایا ہے جو عورت سے برائے نام محبت کا ڈھونگ رچاتا ہے اور محض وقت گزاری کے لیے اس سے پیار کرتا ہے عورت کی بے وقوفی اور نادانی کا یہ عالم ہے کہ وہ اس کو حقیقت سمجھ بیٹھی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مگر یہ وقار جیسا کردار سہارا دینے کے بجائے اِس عورت کی تذلیل کرنے پر اُتر آتا ہے اور کہتا ہے:

"یہ سب جھوٹ ہے، تمہیں کسی سے محبت نہیں، تم جیسی عورتیں
کسی کی بھی نہیں ہوتیں اور نہ ہی محبت جیسے جذبے کو سمجھ سکتیں
ہیں۔" (20)

ساجد خان کا افسانہ "کل مونہی" کا کردار صداقت بھی ایک ایسا کردار ہے جو عورت کو اپنی محبت میں گرفتار کر کے اسے اپنانا چاہتا ہے۔ یہ عورت (نائلہ) کے گھر میں رضامندی نہ ہونے کے باعث صداقت اسے بھاگ کر لے جانے پر راضی کرتا ہے اور اس طرح وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کامیابی چند ہی برسوں تک قائم رہتی ہے اور نائلہ کی اولاد میں مسلسل بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور صداقت اس پر نہ صرف غصے کا اظہار کرتا بلکہ بیوی کو مار پیٹ اور ظلم و جبر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا۔

> "نائلہ جب بھی بیٹیوں کے لیے کچھ مانگتی تو اُسے ماسوائے مار کھانے کے کچھ نہ ملتا۔ کچھ دیر ہنگامہ رہتا گالیوں اور رونے کی آوازیں بلند ہوتیں برتن ٹوٹتے پھر دروازہ زور سے بجتا۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کے بعد اچانک خاموشی سی پھیل جاتی۔ وہ اپنے پھپھولے پھوڑنے کے لیے خود کو کوستی، گال پیٹتی۔ اس لمحے اس کے چہرے کی کساوٹ سے اس کے کرب کا اندازہ ہوتا۔ بیٹیاں بھی روز روز کے اسی اذیت ناک رویے سے آچکی تھیں" (21)

جب یہ کامیابی ایک نیا راستہ متعین کر لیتی ہے تو صداقت دوسری شادی کر لیتا ہے۔ تاکہ اس کے بیٹے ہوں۔ اس سلسلے میں اس کو اپنی محبت کی اور اولاد کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ساجد خان نے ان کرداروں کے ذریعے معاشرے کے بدلتے حالات اور منفی اثرات کو بیان کیا ہے۔ ان کا ہر افسانہ ایک نیا موضوع اور نئے کردار کو سامنے لاتا ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں اکتاہٹ اور بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔

ساجد خان نے افسانہ "نئی کہانی" میں بہت سے ایسے کردار پیش کیے ہیں جو مختلف سماجی مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کہانی کا سب سے اہم کردار ایک ایسی عورت ہے جو اپنی نزاکت و عورت

ہونے کے ناطے سماج میں برئی پھیلاتی ہے۔ جسم کا کچھ حصہ ننگا کر کے بھیک مانگتی ہے۔ اسی نزاکت اور عریانی کشش کی وجہ سے لوگ اسے نہ صرف کچھ نہ کچھ دے دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات یہ عورت چند پیسوں کے عوض اپنا جسم فروخت کر کے کچھ وقت کے لیے غائب بھی ہو جاتی ہے۔ اس کردار کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

"وہ ایک جانب سے آستیں اور دوسری جانب سے بغل چاک کیے کالے کپڑے پہنے اپنے سفید جسم کی جانب راغب کر کے بھیک مانگ رہی تھی۔ جس کا جسم نزدیک سے دیکھنے، اس سے آنکھیں چار کرنے اور ہاتھ چھونے کی خاطر بے شمار لوگ اپنی جیبیں ٹٹولتے۔ پھر نجانے وہ کس ترازو میں اُن کا تول کرتی اور کچھ دیر کے لیے کسی نہ کسی کے ساتھ غائب ہو جاتی" (22)

افسانہ نگار نے عریانیت اور بے رہروی جیسے منفی پہلو کے علاوہ اس افسانے میں دیگر ایسے کردار بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو سماج میں سیاسی، معاشی اور اقتصادی برائیاں پھیلا رہے ہیں۔ "نئی کہانی" میں افسانہ نگار نے چھوٹے چھوٹے پلاٹ ترتیب دے کر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کی ہے۔ یہ ایک منفرد اور الگ اندازِ بیان ہے کہ مصنف کہانی میں پلاٹ اور کردار کو اسی موقع محل کے مطابق پیش کر کے قارئین پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اسی لیے پروفیسر سید وقار عظیم ایسی کہانی اور ترانے پلاٹ و کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں:

"کردار نگاری کا یہ نفسیاتی طریقہ اب ناولوں اور افسانوں میں بہت عام ہوتا جا رہا ہے اس طریقے نے افسانہ نگاری کے فن میں زبردست تبدیلیاں کی ہیں۔ افسانہ نگاروں کو اب انسانی ذہن کے

> مطالعہ میں نظر کی گہرائی اور فکر کی صفائی سے کام لینا پڑتا ہے اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو "شعور کی رو" سے افسانہ کی رفتار اس کی ترتیب میں جو ظاہری بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے وہ پڑھنے والوں کے ذہن کو ایسے الجھاوے میں مبتلا کر دے کہ اس کے لیے کردار کے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا ممکن ہو جائے مجموعی طور پر بغیر پلاٹ یا متعدد چھوٹے چھوٹے پلاٹوں سے بنا ہوا افسانہ ایک مجموعی تاثیر چھوڑتا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ساجد خان کا افسانہ " نئی کہانی" اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس میں معاشرے کے ہر فرد کو اپنا موضوع بنا کر کرداروں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ کردار سماج کے نچلے طبقے سے لے کر متوسط طبقہ اور متوسب طبقے سے بالائی طبقہ (سرمایہ دار) اس افسانے کے اہم کردار ہیں۔

مختصر یہ کہ ساجد خان کی کردار نگاری نے ان کی تحریروں اور افسانوں کو نہ صرف جاندار بنا دیا ہے بلکہ سماجی مسائل اور بدنظمی کو بھی ان کے ذریعے حقیقت سے روشناس کیا ہے۔ اس لیے ساجد خان کی کردار نگاری ان کے افسانوں کی جان ہے۔ وہ اپنے گردو پیش کا جائزہ لے کر اپنی کرداروں کے ذریعے زندگی کو مختلف رنگوں کی صورت میں اجاگر کیا ہے۔ اکثر مقامات پر وہ قاری کو اپنے روبرو مخاطب کرتے ہیں تو بعض واقعات و حوادث کو تبصرہ کیے بغیر کسی واسطے کے جیسا دیکھا اور محسوس کیا اسے ہوں ہی کرداروں کے ذریعے افسانوں میں حقیقی رنگ وروپ سے تخلیق کرتے ہیں۔

4-نقطۂ نظر

وحدتِ تاثر:

افسانے کے فنی لوازمات میں ایک اہم عنصر نقطہ نظر ہے۔ جس میں کسی ایک ہی واقعے یا مقصد کو بیان کیا جاتا ہے۔ بغیر طوالت کے قارئین پر ایک تاثر قائم کرنا ہی نقطہ نظر کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ معیاری افسانے میں ایک سے زائد مقاصد ہوں تو ایسے افسانے کو کامیاب افسانہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا اثر نہایت کم، پھیکا اور بے ڈھنگ ہونے کے ساتھ ساتھ غیر دلچسپ ہو جاتا ہے۔ افسانے جیسی صنف کے لیے یہ لازم ہے کہ جس طرح کسی ایک واقعے یا مقصد کو مختصر پیرائے میں بیان کیا جائے تو وہ افسانہ مؤثر اور جاندار ہو گا۔ قارئین کے دل ودماغ پر دلچسپ اور گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ بقول انور جمال:

> "افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعے یا ایک پہلو کی وہ خلاقانہ اور فنی پیش کش ہے، جو عموماً کہانی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ ایسی تحریر جس میں اختصار اور ایجاز بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وحدت تاثر -- ------- Unity of Impression اسکی سب سے اہم خصوصیت ہے۔"(22)

مندرجہ بال اقتباس سے معلوم ہوا کہ افسانے جیسی صنف میں نقطہ نظر یا وحدت تاثر جیسے پہلو کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس پہلو کو ہم ادبی اصلاح میں افسانے کی روح قرار دیں تو بے جانہ ہو گا۔ کیونکہ یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کے باعث قارئین پر دلچسپ اور گہرے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور پوری کہانی کو با آسانی سمجھ جاتا ہے۔ یہ کمال افسانہ نگار کا ہوتا ہے کہ وہ افسانے میں کس قدر واقعات اور

کرداروں کو باہم مربوط، متحد اور منظم کر کے پیش کرتا ہے جو قارئین کے لیے تاثراتی حیثیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

افسانہ نگار جب افسانے میں مختلف موضوعات جیسے نفسیاتی ،سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو بیان کرتا ہے۔ تو ان میں ضرور تاثر کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کسی بھی موضوع کو بیان کرنے کے لیے تخلیق کار کسی ایک مقصد پر زور دیتا ہے جس کے باعث افسانے میں یہ فنی خوبی نمایاں نظر آتی ہے۔ اس لیے افسانے میں وحدتِ تاثر ایک بنیادی اور لازمی شے ہے، جو افسانے کو بے جا طوالت سے بچاتی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "افسانے میں اتحاد اثر پیدا کرنے کے لیے افسانہ نگار کو جس چیز کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیے وہ یہ ہے کہ افسانہ میں وہ ہمیشہ صرف ایک مقصد پر زور دے۔ ایک افسانے میں ایک سے زیادہ مقاصد کی طرف متوجہ ہو جانے سے فنی خرابیاں پیدا ہو جاتیں ہیں اور دوسری طرف سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ فسانہ نگار کو اپنی توجہ ایک چیز کے بجائے مختلف چیزوں کی طرف کرنی پڑتی ہے اور ہر پہلو کو نمایاں بنانے کی کوشش میں اس کا سب سے زیادہ اس کا اہم پہلو تاریکی میں پُر ہو جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا بھی افسانے کے مقصد میں یکسائی کے ساتھ دلچسپی نہیں لے سکتا۔"(25)

اسی لیے نئے لکھنے والوں میں ساجد خان وہ افسانہ نگار ہیں جن کی کہانیاں ہر فن کی تکمیل کرتی ہیں۔ ان کے افسانے اسی لیے اہمیت کے حامل ہیں کہ وہ افسانے کے فنی لوازمات کو مدِ نظر رکھ کر افسانہ

تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں وحدتِ تاثر کا وصف نمایاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی مقصد پر زور دیتے ہیں جس سے قارئین کے دل و دماغ ہر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ بے جا طوالت سے گریز کرتے ہوئے کسی ایک نقطہ نظر کے تحت محض ایک مقصد کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ افسانہ "اثاثہ" سے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"میرے پھٹے پرانے جوتوں کے چہرے پر برسوں کو سفر طے کرتے اور مختلف موسموں سے ملتے ملاتے اس قدر شکنیں اور شگاف پڑ چکے تھے کہ اب پانی، کیچڑ اور گرد بغیر کسی مزاحمت تلووں آر پار گزر جاتی میں جب کبھی دوستوں عزیزوں کے ساتھ کسی محفل، ہوٹل یا کسی بھی تقریب میں جاتا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا کہ سب میرے چہرے کی بجائے میرے پاؤں کی طرف دیکھ رہے ہیں،۔۔۔۔۔۔ میں پریشان ہو جاتا۔۔۔۔۔۔۔ سردی کے موسم میں پاؤں کی ٹھنڈک سر میں درد کر دیتی تھی اور اگر کسی گیلی جگہ پر پاؤں پڑتا تو فوراً گیلے ہو جاتے۔"(26)

افسانہ نگار نے جس طرح افسانہ "اثاثہ" میں غربت وافلاس کو بیان کیا ہے۔ ابتدا تا انتہا ایک ہی اثر چھوڑتا ہے کہ ایک شخص غریب ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اور آرام وسکون اپنی اولاد کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ خود پھٹے پرانے جوتے اور لباس زیب تن کیے ہوئے ہے مگر اولاد کے لیے ہر طرح کی آسائشات اور سہولیات مہیا کرنے کے لیے تگ و دو کر رہا ہے۔ یہ شخص اپنی وضع قطع سے مطمئن اور خوش ہے۔ کیونکہ کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو زندگی کی ہر آسائش سے بھرپور ہیں مگر پرانے اور پھٹے لباس کا استعمال کرتے ہیں جیسے:

"میرے ارادے کو نئی توانائی اُس سیٹھ کو دیکھ کر ملی جو کروڑوں
روپے آمدنی ہونے کے باوجود پرانے جوتے اور پرانی بنیان زیبِ
تن کیے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر میری خوداعتمادی میں دوگنا اضافہ
ہوگیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ میں ایک غریب شخص ہوں
اور میرے سامنے لاکھوں کروڑوں روپے کے اثاثہ جات رکھنے والا
گزرا ہے۔ اس میں اور مجھ میں صرف کروڑوں کا فرق ہے۔ حالانکہ
اس نے بھی جوتے پرانے ہی پہن رکھے ہیں۔ میں احساس
شرمندگی کے حصار سے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے نئے جوتے
خریدنے والوں اور کئی کئی جوڑے کپڑے سلوانے والوں کے
بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔"(27)

ساجد خان کے تمام افسانے وحدت تاثر جیسے فنی عنصر سے بھرپور ہیں۔ جس طرح انہوں نے افسانہ "اثاثہ" میں ایک ایسے موضوع کو تخلیق کیا ہے۔ جس کا پس منظر بھوک اور غربت ہے۔ مگر لفظ "غربت" اس افسانے میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ مگر افسانہ پڑھنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ افسانہ نگار کا مقصد غربت و افلاس ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساجد خان کے دیگر افسانے اس فنی پہلو کی وجہ سے جاندار افسانے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان کا افسانہ "نئی کہانی" ایک شاہکار ہے۔ کیونکہ عنوان تو نئی کہانی ہے مگر بہت سے موضوعات ایک ایسے تسلسل کے ساتھ پیش کیے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ مضامین روایتی ہونے کے باوجود بھی نئے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے:

"چار گھر چھوڑ کر ایک جھونپڑے کے مکینوں کی بھوک بارے لکھا
جائے تو کیا فائدہ؟

سب جانتے ہیں وہ بھوکے ہیں۔۔۔۔۔۔۔اُن کی بھوک بھری کہانی
سے بھلا کسی کو کیا سروکار؟

ایسی کہانیاں اخبارات، رسائل اور ٹی وی اپنی خبروں، خصوصی
ایڈیشنوں اور پروگراموں میں پیش کر کے خوب رقم بٹور رہے
ہیں"(28)

مگر افسانہ نگار اسی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نئی بات بیان کرتے ہیں جیسے:

"وہ نوجوان گاڑی نہیں چلا سکتا تھا مگر کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و
چراغ تھا کئی لوگوں کی زندگیوں کے چراغ گل کرنے کا سبب بنا۔اس
پس منظر میں ایک کہانی بار بار کہہ رہی تھی کہ مجھے لکھو، لیکن یہ بھی
کوئی نئی کہانی تو نہ ہوئی۔" (29)

ساجد خان کے افسانے کا یہ کمال ہے کہ ان میں فنی پختگی پوری طرح پیوست ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ اور سلیقہ بخوبی جانتے ہیں۔ جیسے افسانہ "نئی کہانی" میں ایسے مضامین کو برتا گیا ہے جو روایتی ہیں۔ مگر مصنف نے ہر موضوع کو اسی انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ کہانی بھی لکھتے ہیں مگر اس لکھنے پر رضامند اور خود اعتمادی کا اظہار نہیں کرتے۔ بیزاری قارئین کے دل و دماغ پر تاثر چھوڑتی ہے۔ افسانے کے آخر میں ساجد خان اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ہوں رقم طراز ہیں:

"میرا وہ دوست ٹھیک ہی کہتا تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔ تم پاگل ہو
۔۔۔۔۔۔۔۔لفظوں کے گورکھ دُھندے اور خیال کی دنیا میں
پھنس کر قدم قدم پہ تھپیڑے کھائے جا رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔اس

نے یہ بھی تو کہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ جہاں احساسات کو محسوس کرنے کی

حس ختم ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جہاں خیال کو سمجھنے والا کوئی نہ ہو

۔۔۔۔۔۔۔ جہاں خیال کی کوئی قدر نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہاں خیال کو لفظوں کا پیرہن پہنا کر تحریر تو کیا جا سکتا ہے مگر اس

تحریر سے تحریک پیدا نہیں کی جا سکتی۔۔۔۔۔۔۔۔"(30)

مختصر یہ کہ ساجد خان کی تحریروں میں وحدت تاثر کا وصف انتہائی عروج پر ہے۔ ان کے تمام تر افسانے اسی فنی پہلو کی نسبت محض ایک یہ مقصد کو بیان کرتے ہیں۔ وہ اسی مقصد کو نہایت احسن طریقے سے قاری تک پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ وہ افسانوں میں غیر ضروری تفصیل سے کام نہیں لیتے بلکہ نہایت اختصار کے ساتھ کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ کسی نہ کسی مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ جو افسانہ بھی تخلیق کرتے ہیں اس میں ایک نظریہ، ایک مقصد اور ایک تاثر ضرور کار فرما نظر آتا ہے۔ اسی لیے ساجد خان بھی اس فنی عنصر کا استعمال عمدگی سے کرتا ہے۔ اور بے جا طوالت سے گریز ہوئے تاثر قائم کرتے ہیں۔

5- مکالمہ نگاری:

ادبی اصطلاح میں مکالمہ نگاری سے مراد افسانہ، ڈراما یا کہانی میں دو یا دو سے زائد افراد کی باہمی گفت و شنید انہی کے الفاظ میں بیان کرنا ہے۔ افسانہ نگار یا ڈراما نگار اپنی کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے مکالمہ نویسی سے کام لیتے ہیں۔ جس کے باعث کہانی کا آغاز و اختتام پُر امن اور دلچسپ انداز میں ہوتا ہے۔ بقول ابو الاعجاز حفیظ صدیقی:

"دو یا دو سے زیادہ اشخاص کی گفتگو کو انہی کے الفاظ میں نقل کرنا، ادبیات کی اصطلاح میں مکالمہ کہلاتا ہے۔ سقراط مکالمے ہی کے ذریعے سے تعلیم دیتا تھا۔ افلاطون نے بھی فلسفیانہ فکر و استدلال کے لیے مکالمے کا طریق استعمال کیا ہے۔"(31)

مکالمہ نویسی کا آغاز روایتی اور قدیم ہے مگر عصرِ حاضر کے اکثر تخلیق اس فنی عنصر کو اپنی تحریروں میں بڑی ہنر مندی اور چابکدستی سے برتتے ہیں۔ اگرچہ مکالمہ نویسی کا استعمال دیگر اصناف جیسے ناول، ڈراما اور سوانح نگاری میں بھی کیا جاتا ہے مگر افسانے میں اس کی اہمیت مزید واضح اور سود مند ثابت ہوتی ہے۔ اشخاص کے درمیان بات چیت ان کے جذبات و احساسات اور نفسیات جھلک کر واضح ہو جاتی ہے۔ کہانی میں مکالموں کے ذریعے اچھے اور برے کرداروں کی پہچان ہوتی ہے۔

ساجد خان نے اپنے افسانوں میں کرداروں سے بھرپور مکالمہ نگاری کا کام لیا ہے۔ ان کا افسانہ "بے بسی، بے چارگی، درماندگی" میں فلسفیانہ گفتگو کے ساتھ ساتھ بہت سے کرداروں سے مکالمات سننے کو ملتے ہیں۔ جس سے اُن کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اُسی طرح افسانہ "مکافاتِ عمل" میں ملک وقار اور ایک عورت آپس میں گفتگو کرتے ہیں، جس میں عورت ملک وقار سے شادی کرنا چاہتی ہے اُسے اپنانا چاہتی ہے لیکن وہ اس سے دوری اختیار کرتا ہے۔ اسی تناظر میں مکالمات ملاحظہ کیجیے:

"میری بات سنو!۔۔۔۔۔میں حقیقت پسند انسان ہوں"۔۔۔۔۔ اگلے ہی لمحے وہ سوچنے لگا کہ حقیقت تو ننگی ہوتی ہے۔ "دیکھو میں تم سے شادی نہیں کر سکتا، میرا معاشرے میں ایک مقام ہے، اور تم جیسی عورت میری بیوی نہیں بن سکتی۔"

"خدارابس کرو۔۔۔۔۔۔بس! مجھے روز روز ذلیل نہ کیا کرو"۔وہ
بات ملنے سے انکاری تھی۔

"تم کیسی عورت ہو؟۔۔۔۔۔وہ چلایا"

"کیوں کیسی ہوں میں ؟ تم سے ملتی ہوں تو کیا میں سارے زمانے
۔۔۔۔۔"

بس۔۔۔۔۔۔بس کرو یہ ڈھونگ۔"(32)

افسانے میں مرد اور عورت کی باہمی گفتگو سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ ایک عورت جو اپنی نادانی کے سبب ملک وقار بے حد پیار کرتی ہے جب کہ ملک وقار اس کی محبت والفت کو ٹھکراتا ہے اور اسے ذلیل ورسوا کرتا ہے۔افسانہ نگار نے کہانی میں مکالمے کے ذریعے دلچسپی کا عنصر چھوڑا ہے جس کو پڑھ کر قاری کی جستجو بڑھ جاتی ہے کہ ساری کہانی کو پڑھا جائے کہ آگے کیا ہو گا۔اسی طرح ان کا افسانہ "کل مونہی" بھی مکالمہ نگاری کی زندہ مثال ہے۔اس افسانے کا آغاز ہی مکالمے سے ہوتا ہے۔جیسے:

"صداقت کیا بات ہے۔۔۔۔۔۔۔خیریت تو ہے۔۔۔۔۔۔۔
آج کچھ خاموش،خاموش سے ہو؟وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے
لگا۔۔۔۔۔اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔۔۔۔۔۔بس رہنے دو
۔۔۔۔۔کیوں کیاہوا۔۔۔۔۔۔کچھ بتاؤتو؟

وہ بات کرنا چاہتا تھا مگر کہاں سے شروع کرے۔۔۔۔۔۔اس
تذبذب میں مبتلا تھا۔۔۔۔۔۔کچھ دیر خاموشی کے بعد پوچھنے لگا:

تمہارا عورت کے متعلق کیا نظریہ ہے؟؟؟؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں اس
کے سوال کے پس منظر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے سوال دہرا دیا۔
"عورت کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔"(33)

افسانہ نگار اپنی زبان سے عورت کی زندگی کے متعلق فلسفیانہ گفتگو کرتا ہے مگر صداقت ان کی بات کو کاٹ کر اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جس لڑکی سے محبت کرتا ہے اس کی شادی کہیں اور طے ہو جاتی ہے۔ وہ اسے گھر سے بھاگ جانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کیفیت اور جذبات کو افسانہ نگار مکالمے کے ذریعے ہوں بیان کرتا ہے۔

"عورت صرف مطلب پرستی کا دھوکا دہی کا نام ہے۔ جب تک اس
پر منوں مٹی نہ پڑ جائے، اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا
بےوقوفی ہے۔"(34)

اس افسانے میں مکالمے کے ذریعے کرداروں کی اصلیت سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ ان کی گفت و شنید اور بحث و مباحثہ سے نظریات کُھل کر قارئین کے سامنے آتے ہیں۔ یہی خصوصیت افسانے میں دلچسپی اور تاثیر کے عناصر فراہم کرتی ہے۔

ساجد خان کے متعدد افسانے مکالمہ نگاری کی بہترین مثال ہے۔ جس کو پڑھتے ہی اک عکس اور تصویر انسانی ذہن پر اُبھر آتی ہے۔ یہاں افسانہ "نیند" اس کی عمدہ مثال ہے جیسے:

"جی ہا جی"!!! اُسے سامنے والوں پر بھی غصہ آیا یہ سامنے والے بھی پڑھے لکھے جاہل ہیں۔ "بھنڈی کا کیا بھاؤ ہے۔۔۔۔۔؟ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے والی عورت کے گلے میں بھی لاؤڈ سپیکر لگا ہے۔ 45 روپے کلو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ریڑھی والے کا جواب سنائی دیا۔

"ارے اتنی مہنگی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"اللہ تیرے گلے کو خراب کرے۔۔۔۔۔۔۔طاہر علی نے دل ہی دل میں عورت کو بد عادی۔
آدھا کلو دے دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بیس روپے دوں گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"(35)

افسانہ نگار نے اس مکالمے کے ذریعے طاہر علی کی نفسیاتی الجھنوں کو رقم کیا ہے۔ یہ کردار گھر، بازار، شہر اور مسجد کسی بھی جگہ پر راحت و سکون حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ یہی فن کار کا کمال ہے کہ انہوں نے معاشرے میں رہنے والے لوگوں کی ذہنی کیفیات کا ادراک کیا ہے۔ جس کے باعث ان کے اچھے اور برے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ساجد خان نے مکالمہ نگاری سے ماحول، زندگی اور کرداروں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ جس کے پس منظر میں ان کی مکالمہ نگاری کا عمل دخل ہے۔ ان کی مکالمہ نگاری کے متعلق اجمل نذیر لکھتے ہیں:

" فلسفیانہ انداز گفتگو، الفاظ کا برجستہ استعمال فہم و فراست میں ڈوب کر نہاں سے عیاں کی سمت عازمِ سفر ہونا، افسانے کے اندر ماحول کی بھرپور وضاحت اور اس ماحول کے عین مطابق اندازِ گفتگو کا برتاؤ۔ افسانے کے کرداروں میں حقیقی جان ڈال کر ایسے مکالموں کی ادائیگی جس سے نہ صرف ماحول کی عکاسی ممکن ہو بلکہ کرداروں کی بالغ نظری کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔"(36)

ساجد خان کے افسانوں میں ان کے مکالمے ہی دلچسپی کے عناصر فراہم کرتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مکالموں کے ذریعے کرداروں میں جان ڈالی ہے۔ دراصل مکالمہ اور ماحول ہی سے اچھی کہانی تحریر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ قاری اس مکالماتی انداز کو پڑھتے پڑھتے کھو جاتا ہے اور خود کو بھی کہانی میں شامل کر لیتا ہے۔ افسانہ نگار کے افسانوں کی یہ خاصیت ہے کہ انہوں نے ماحول کو

ذہن میں رکھتے ہوئے کرداروں کے ذریعے ان کے جذبات اور افعال کو سامنے لایا ہے۔ کامیاب مکالمہ وہی ہوتا ہے جو اس مقصد کو مدِ نظر رکھ کر لکھا جائے۔ ساجد خان کے افسانے ہر فنی لحاظ سے ہر فنی عنصر سے بھرپور ہیں۔ جس طرح وہ مکالمہ نویسی پر اپنا وقت صرف کرتے ہیں بعینہ وہ دیگر فنی لوازمات کو بھی مدِ نظر رکھ کر اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔ ان فنی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے مقصدیت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ افراد کے درمیان اس انداز سے گفتگو کو بیان کرتے ہیں کہ ان افراد کی سچی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ انہوں نے گہرے مشاہدے سے ماحول اور کرداروں کو خاص سانچے میں ڈال کر تخلیق کیا ہے۔ اسی منفرد خوبی کی وجہ سے وہ عصرِ حاضر کے جدید افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

4- منظر نگاری / فطرت نگاری:

دیگر فنی لوازمات کی طرح منظر نگاری بھی افسانوی ادب کا ایک اہم حصہ ہے۔ جس کے ذریعے مصنف پُر تاثیر مقاصد، کردار جاندار اور حقیقت نگاری کی جھلک دیکھاتا ہے۔ منظر نگاری کا بنیادی مقصد ہی ہوتا ہے کہ مصنف لفظوں کے ذریعے کسی جگہ، شخص یا چیز کا نقشہ اس طرح کھینچنا کہ وہ تصویریں قارئین کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگیں۔ دراصل منظر نگاری اور فطرت نگاری دو اصطلاحات ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ منظر نگاری میں مصنف کسی چیز کی من و عن تصویر کھنچنے کے علاوہ دیگر ایسے واقعات کو بیان کرتا ہے۔ جو انسانوں کی تخلیقی کمالات پر مبنی ہوتی ہیں جیسے عمارات، راستے، سڑکیں اور مجسمہ سازی وغیرہ۔ مگر فطرت نگاری میں مذکورہ بالا تمام عناصر کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر پیدا کی ہوئی کائنات، قدرتی حالات، اس کے علاوہ انسان کی فطرت، اس کے احساسات، جذبات، ادراک، طبیعت، پیدائشی صفات اور جبلات وغیرہ کی تصویر لفظوں میں کھینچی جاتی ہے۔ اسی ضمن میں پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

> "فطرت بطور اصلاح کئی علوم میں مستعمل ہے۔ ادب میں یہ اصلاح کئی معنوں میں استعمال ہوتی ہیے۔ زمین و آسمان اور ان کے مابین جو بھی مظاہرہ انسان کی ذات کے باہر جلوہ ریز ہیں وہ فطرت کہلاتے ہیں۔ پھر خود انسانی ذات کے اندر ایک فطرت ہے یعنی اس کا وجدان، جبلات، جذبات واحساسات، رد عمل اور ہیجانات کی شکل میں علاوہ اذیں مظاہر کائنات کی اشیا کی وہ خصوصیات بھی فطرت کہلاتی ہیں جن کی اپنی جبلت اور سرشت ہے۔"(37)

گویا زمین و آسمان کے مظاہر کے علاوہ انسانی جذبات و احساسات یعنی خوشی، غم بھی فطرت کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیونکہ کائنات میں ہر ایک کی اپنی فطرت، خلقت، عادت، انسانی پیدائشی صفات ع خصوصیات ہوتی ہیں جو اُسے قدرت کی طرف سے ملتی ہیں۔ اسی لیے منظر نگاری کا دوسرا رُخ فطرت نگاری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جب مصنف منظر نگاری سے کام لیتا ہے۔ تو وہ کائنات کی بنی اور بنائی تمام چیزوں کو لفظوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔

ساجد خان کے افسانوں میں منظر نگاری اور فطرت نگاری جیسے عناصر کی جھلک نمایاں دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں الفاظ کے ذریعے کمال کی منظر کشی کی ہے۔ وہ نہ صرف انسانی ذات کی خوبیوں اور خامیوں کو لفظی جامہ پہناتے ہیں بلکہ زمین وآسمان کے مابین تمام تر فطری اور قدرتی عناصر کو بھی یہ خلعت عطا کرتے ہیں کہ قارئین کے سامنے تصاویر چلتے پھرتے لگتی ہیں۔ ان کی منظر نگاری سے کوئی افسانہ بھی عاری نہیں، ان کو منظر کشی کا جو ملکہ حاصل ہے شاید ہی کسی دوسرے ہم عصر افسانہ نگاری اس میں یہ جوہر دیکھائے۔ چند منتخب افسانوں سے ان کی منظر نگاری کی عمدہ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

"اسلام آباد سے مظفر آباد تک کو بالہ سے آگے تمام راستے بند تھے، بالا کوٹ ملیامیٹ ہو چکا تھا اور اس سے آگے مظفر آباد تک تمام سڑکیں لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے مکمل طور پر بند ہو چکی تھیں۔ ملک بھر سے گاڑیاں منوں تنوں کے حساب سے سامان لیے مظفر آباد، بلا کوٹ اور گرد و نواح کے علاقوں کے لیے روانہ ہو چکیں تھیں، راولپنڈی سے آگے شدید ٹریفک جام تھی"(38)

ساجد خان نے اپنے افسانے "مکافاتِ عمل" میں زلزلے کے وقت ہونے والی تباہی اور واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہی سانحہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور یوں وہ حقیقت نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے انہوں نے منظر نگاری میں واقعات نگاری کے ساتھ اپنے افسانوں میں دلچسپی کے عناصر فراہم کیے ہیں۔ اسی لیے ابتدا تا انتہا دلچسپی و خوبصورتی یوں ہی بر قرار رہتی ہے اور قاری کو اپنے ساتھ جڑر کھتی ہے۔ اس کی عمدہ مثال افسانہ "نئی کہانی" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"اُس دن کھانے جیسا مزا آج تک نہیں آیا۔ کھایا بھی تو خوب تھا، مکئی کی تازہ روٹیاں، سرسوں کے ساگ کے ساتھ سونچل کا ساگ، گڑ نجی میں لسی، پودینے کے ساتھ کچھ تمیز کا چھڑکاؤ، چار ہری مرچیں، ٹماٹر اور لہسن کو مکس کر کے بنائی گئی چٹنی، جس میں دہی کی آمیزش بھی تھی، مکھن کا پیڑا، مٹی کے فرش پر بچھایا گیا دستر خوان۔"(39)

ساجد خان نے اپنے افسانوں میں واقعات نگاری کو جزئیات نگاری سے منسلک کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ گلی، محلے مکانات اور دکانوں کی بھی خوب تصویر کشی کی ہے۔ جیسے:

"اُس کا گھر محلے کی نکڑ کے ساتھ دوسرے نمبر پر واقع تھا۔ گھر کیا تھا۔ اسے والدین کی جانب سے جو دو مرلے زمین وراثت میں ملی تھی۔ اس پر ایک کمرہ، ایک غسل خانہ اور کمرے کے سامنے چھوٹا سا چھپر ڈال کر رہ رہا تھا۔ کیونکہ چھپر کے سامنے جونہی بر آمدہ شروع ہونے کو ہوتا تو بیرونی دروازہ آجاتا، دروازہ کھول گلی کو جا، یہی کل اثاثہ تھا۔"(40)

افسانہ "کتے" میں افسانہ نگاری نے جس قدر رنگ بھریں ہیں، انتہائی قابل غور ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ جس طرح انہوں نے افسانے کا موضوع "کتے" کا انتخاب کیا ہے دراصل ان لوگوں کے لیے یہ علامت ہے جو دین و دنیا اور اپنی تہذیب و ثقافت کو بھول کر بے راہ روی کا شکار ہو چکے ہیں۔ افسانے کی ابتدا میں مصنف یوں رقم طراز ہیں:

"آسمان پر چمکتا سورج غروب ہو رہا تھا۔ روشنی سرخ لباس پہن چکی تھی اور سرخی نیلاہٹ اور نیلاہٹ سیاہی میں بدل رہی تھی۔ ہر چیز کو اندھیرے نے اپنے دامن میں بھرنا شروع کر دیا تھا۔ فضا میں اڑتے پرندوں کی آوازوں میں عجیب سی بے چینی تھی۔ وہ اپنے گھونسلوں کی جانب پلٹ رہے تھے۔ پرندے روشنی کو اندھیرے میں بدلتا دیکھ کر کچھ بے چین سے لگتے تھے۔ گلی کی نکڑ پر کتے بھونک رہے تھے۔ بند مارکیٹ کے سامنے دو تین آوارہ کتے کتیا کی جانب غراہٹیں بھر رہے تھے۔ کبھی تیز، کبھی آہستہ، کبھی اوپر، کبھی نیچے، کبھی آگے، کبھی پیچھے، وہ کتیا کے ساتھ بھاگتے جا رہے تھے۔"(41)

ساجد خان کے افسانوں میں منظر نگاری اور فطرت نگاری کو حقیقت پسندی کے رنگ میں نہایت خوبصورتی سے رنگا گیا ہے۔ خاص کر ان کا افسانہ "کتے" علامت نگاری کی عمدہ مثال ہے مگر جس طرح وہ منظر کشی کرتے ہیں تو تصویریں فوراً ذہن میں ابھر آتی ہیں۔ اسی افسانے کے اختتام پر یوں رقم طراز ہیں:

"نڈھال بدن اپنی خوشبوؤں میں بدبو کی آمیزش سے داغدار ہو چکے تھے۔ فٹ پاتھ پر سونے والے آدھی نیند کر چکے تھے۔ جسم جسم سے ٹکرا چکے تھے۔ کتے بھونک بھونک اور لال ٹپکا ٹپکا کر تھک چکے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر طرف خاموشی اور گہرا سکوت تھا کہ اتنے میں ایک آواز سنائی دی۔ جس سے اونچی اور کوئی آواز نہ تھی۔ وہاں سے صرف اللہ اکبر کی صدائیں کانوں میں رس گھومنے لگیں۔ روشنی نے سیاہی کو نیلے ملگجے میں بدلنا شروع کر دیا پرندوں کی آوازوں میں عجیب سرور و مستی تھی۔ پرندے سرخوشی سے سرشار اللہ رب العزت کی حمد و ثنا بیان کر رہے تھے اور کتے اپنے اپنے ٹھکانوں پر گہری نیند سو چکے تھے۔"(42)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ ساجد خان نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کی خوبصورت، سچی اور دلچسپ تصویر لفظوں کے ذریعے کھینچ ڈالی۔ اسی طرح انہوں نے شہر اور گاؤں کے انسانوں، جانوروں، پودوں، درختوں، جھاڑیوں اور دریاؤں کو بھی لفظی جامہ پہنا دیا ہے۔ شہر کی نسبت وہ گاؤں کے ماحول اور آب و ہوا سے گہرا شغف رکھنے کے باعث وہاں کے میلے ٹھیلے، رہن سہن اور موسموں کو بھی بہترین منظر کشی سے صفحہء قرطاس پر مرتسم کیا ہے۔ جیسے:

"گاؤں کی پہاڑی پر برف جمی موٹی تہہ، سر سر کرتی ہوا، پرندوں کا آپس میں دُبکنا، تیز بارش کا کبھی اوپر تو کبھی نیچے چہل قدمی کرنا، درختوں کی ننگی ٹہنیوں کا خوشی سے جھوم جھوم کر نہانا، سامنے والے نالے کا شور مچانا، ندی کا آپے سے باہر کو چھلانگیں لگانا، لکڑیوں کا تڑ تڑکا کر کے جلنا، انگاروں کا اُچھل اچھل کر ادھر اُدھر بھاگنا، آگ کے گرد دائرے میں بیٹھے مرد عورتیں، بوڑھے بچے، کبھی اپنے پاؤں تو کبھی اپنے ہاتھوں کو گرم کیے جا رہے تھے۔ بارش میں بھیگ جانے والی بکریاں کونے میں معصومیت سے آنکھیں جھپک رہی تھیں۔"(44)

اسی طرح افسانہ "خلش" میں بھی افسانہ نگاری گاؤں کی زندگی کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے کہ گاؤں میں صبح کا منظر کسی قدر پر تکلیف اور دلچسپ ہوتا ہے۔ تازہ ہوا، گھاس پر شبنم کے قطرے اور چڑیوں کا چہکنا کتنا پر سکون اور مزے دار ہوتا ہے۔ انہوں نے منظر نگاری سے کام لیتے ہوئے اپنی تحریوں میں دلکشی پیدا کی ہے۔ دیہات کے رہن سہن، طرزِ بود و باش اور طعام و کلام کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ گویا پریم چند کی یاد تازہ ہو جائے۔

ساجد خان کے قلم کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے معاشرے کے ایسی سچی سچی آٹو گرافی کی ہے کہ پڑھتے ہی سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ وہ منظر نگاری کے ساتھ ساتھ قدرتی مناظر کو بھی اپنا موضوع بناتے ہیں۔ جیسے پہاڑ، دریا، اُونچے اور لمبے درخت، بڑی بڑی گھاٹیاں، وسیع و اریض میدان اور سورج کا مختلف رنگوں اور زاویوں سے نمودار ہونا وغیرہ مگر ان کے ہاں جو سب سے بنیادی اور اہم پہلو ہے وہ انسانی فطرت نگاری ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں جنسی موضوعات پر بھی بات کرتے ہیں۔ مرد اور عورت کے اُبھرتے جذبات اور ان کی نفسیاتی کیفیت کو سامنے لاتے ہیں۔ افسانہ "غلاظت" ایک

ایسے شخص کی ذہنی کیفیت کی تصویر پیش کرتا ہے جو کسی بے چینی کے سبب خود سے باتیں کر رہا ہے اور اسے سکون میسر نہیں ہو رہا۔ اس شخص کے متعلق افسانہ نگار لکھتے ہیں:

> "آخر کب تک ان دیکھے خوف سے میں خود کو اس طرح پامال کرتا رہوں گا، مجھے کوئی سبیل نکالنی چاہیے۔ جو چند لمحوں کا ہی سہی پُر سکون تو دے۔ یہ میری خواہش جو میرے اصل سے ہے معاشرے کی فرسودہ، گھسی پٹی روایات نے نقل بنا کر نلچھٹ میں بدل دی ہے۔ کیا اپنی روح کو میں خود داغدار کر رہا ہوں یا معاشرے کی وہ تقسیم اسے ذچ پہنچا رہی ہے جو انہوں نے لبادے کے طور پر اوڑھ رکھی ہے۔ کب تک معاشرے کے رحم وکرم پر سسک سسک کر زندگی گزارتا ہوں گا۔ کب تک دھند میں سفر کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ منزل کا کچھ پتہ ہی نہ ہو اور اگلے دو قدموں پر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا ہو۔ پہلے ایک دھند میں تھا پھر دوسری میں اب تیسری میں آ پہنچا پھر اس کی پاداش میں چوتھی میں دھکیل دیا جاؤں گا۔"(44)

ساجد خان نے حالات وواقعات اور فطرت کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ کچھ تخلیق کاروں کے نزدیک فطرت نگاری ایک ایسا عمل دنیا میں جو مواد موجود ہے اس کو ادب کا موضوع بناتے ہیں وہ جنسی، معاشی، سماجی غرض کچھ بھی ہو اس میں موجود حقائق پیش کرتے ہیں اور یہ حقائق زندگی کے تمام رشتوں سے منقطع کر کے پیش کرنا ساجد خان کے ہاں ایک اہم اور بنیادی وصف ہے۔ جو ان کی تخلیقات کو زندہ جاوید بنا دیتی ہیں۔

7-اختتام:

افسانہ نگار افسانے میں پلاٹ کی تشکیل میں کہانی کی ابتدا اور انتہا کو خوبصورت اور دلچسپ بناتا ہے۔ جس سے کہانی میں کشمکش اور تذبذب پایا جاتا ہے۔ یہی عنصر قارئین کو شروع سے آخر تک اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آخر اس افسانے کا انجام کیا ہو گا۔ کامیاب افسانے میں پلاٹ ہی کو اہمیت حاصل ہے کہ افسانہ نگاری اپنی فنی گرفت کی وجہ سے کہانی کا انجام خوشی، غم یا سبق آموز واقعہ پر کرتا ہے۔ اس ضمن میں سید وقار عظیم یوں لکھتے ہیں:

"ہر اچھے اور سوچے ہوئے پلاٹ میں منتہا کا ہونا لازمی ہے۔ کہانی ایک دھیمی اور نرم رفتار سے ایک سیدھے راستے پر چلتے چلتے یک بارگی اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔ اس بلندی پر پہنچ کر پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے ایک اضطراب میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی فورا کہانی تیزی سے خاتمہ تک پہنچ جاتی ہے۔ افسانہ کی اسی بلند سیڑھی کو منتہا کہتے ہیں۔"(45)

کامیابی افسانہ نگاری وہ ہے جو پلاٹ کو اسی طرح تشکیل دیتا ہے کہ قارئین افسانے کے آغاز ہی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اسی پلاٹ کے ذریعے افسانہ نگار اپنی تحریروں کو بڑے احسن طریقے سے انجام تک پہنچاتا ہے۔ جس کے باعث افسانہ نگار کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے اور قاری پر اپنا تاثر بھی چھوڑتا ہے۔ بقول رفیع الدین ہاشمی:

"ایک اچھے افسانے میں منتہا ضروری ہوتا ہے کیونکہ صحیح قسم کے منتہا کی غیر موجودگی سے قاری پر افسانے کا کوئی تاثر قائم نہیں ہوتا۔ منتہا کے بغیر افسانہ ایک بیانیہ مضمون ہو گا۔"(46)

ساجد خان دور حاضر کے وہ فسانہ نگار ہیں جن کے افسانے ہر طرح کے فنی عناصر سے بھرپور ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو قارئین پر گہرے اثرات مرتب کرتے جاتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ماحول، معاشرہ اور تہذیب کی عکاسی کرداروں کے ذریعے اس منفرد انداز میں کرتے ہیں کہ قارئین خود کو اس میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ وہ جس طرح افسانے کا آغاز انتہائی خوبصورت انداز میں کرتے ہیں اسی طرح اس کا اختتام بھی نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کے افسانے آغاز تا انجام اس انداز میں برتے گئے ہیں کہ جوں افسانہ پڑھنا شروع کیا تو جب تک مکمل نہ کیا جائے تو قاری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ کسی ایک پیراگراف کو نکالنے، خذف کرنے اور چھوڑنے کی وجہ سے مطلب پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا۔ مگر ساجد خان نے جو مواد اپنے افسانوں کے لیے مہیا کیا ہے وہ تخیلاتی یا تصوراتی نہیں ہے۔ وہ اپنے معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور مسائل کو جاننے کا شعور رکھتے ہیں اور اسی سے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر صفیان صفی کہتے ہیں۔

"افسانے کے تین چار بنیادی لوازمات ہوتے ہیں جن میں کہانی، کردار، تہذیب اور روایت سے ہم آہنگی اور اسلوب بیان شامل ہے۔ ساجد خان کے افسانوں میں یہ لوازمات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ دوسری اہم بات ان کی کہانیوں میں ہزارہ اور بالخصوص حویلیاں کے مضافات کی تہذیب و معاشرت کے تمام عکس جھلماتے ہیں۔"(47)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ ساجد خان کے افسانے اس لیے دلچسپ اور پُر تاثیر ہیں کہ انہوں نے بے شمار بکھرے مسائل اور انسانی خیالات اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ جس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر فرد اسے اپنی کہانی سمجھتا ہے۔ انہوں نے تمام موضوعات کو اس قدر خوبصورت اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے کہ موضوع روایتی ہوتے ہوئے بھی نیا معلوم ہوتا ہے۔ افسانے کی ابتدا

میں ان کی زبان بیان اور الفاظ کے چناؤ کے ساتھ ساتھ اس قدر دلچسپ آغاز ہوتا ہے مکمل افسانہ پڑھے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اس حوالے سے ان کے چند افسانوں سے اقتباس ملاحظہ ہوں:

> "انسان کبھی کبھی دوڑ دھوپ، مصروفیت، ہنگاموں سے الگ ہو کر سکون اور خاموشی بھی چاہتا ہے۔ کبھی ٹہلنے کے لیے وسیع و عریض کھیتوں کا رُخ کرتا ہے تو کبھی ریگستانوں میں ریت کھنگالنے لگتا ہے اور بعض اوقات سمندر کے ساحل پر چہل قدمی کئی ایسے بھی ہیں جو باغات میں سبزے کو پاؤں تلے روند کر پر سکون حاصل کرتے ہیں۔ فطرت نے انسان کی قلبی تسکین کے لیے سامان کر رکھا ہے۔ شہر کے گرد غبار، شور شرابے، دھوئیں اور تعفن کے مقابلے میں بلند و بالا، سرسبز وشاداب پہاڑ، لمبے چوڑے کھیت، ساحل اور ویرانے بھی اسی زمین پر موجود ہیں۔"(48)

اس اقتباس سے دلچسپی کے عناصر کے علاوہ غور و فکر اور تخلیل انگیز ماحول میسر آتا ہے۔ قاری اس میں دلچسپی لیتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور ایسے مقامات سے گزرنا چاہتا ہے جہاں سے افسانہ نگار گزارتا ہے۔ اسی طرح کرداروں کے ذریعے واقعات گزرتے ہیں اور پھر آخر میں افسانہ نگار اختتام کچھ اس انداز سے کرتا ہے:

> "میں نے اسی غریب کے مٹی کے گھروندے پر نظر ڈالی وہ کونے میں ایک ڈھیر کے عقب میں تھا جبکہ اس دوسرے گھروندے سے بہت دور جو کہ تمام گھروندوں کے وسط میں قدرے بلندی پر تھا۔ میں نے آسمان کی جانب دیکھا جہاں نو ظلمت کو ختم کیے جارہا تھا۔ اندھیرے بھاگ رہے تھے۔"(49)

افسانہ "گھروندا" کا آغاز واختتام افسانہ نگار نے انتہائی منفرد اور دلچسپ انداز میں رقم کیا ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ دنیا کے تمام گھروندے فانی اور بے ڈھنگ ہیں جبکہ وہی گھروندا باقی رہے گا جس کی حقیقت سے دنیاوالے ناآشنا ہیں۔ افسانے کے آغاز میں منفرد اسلوب بیان اور نقطہ ءعروج پر ایک اہم تاثر اور مقصد، جبکہ انجام پر غور و فکر قائم کرنا ساجد خان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور افسانہ "دردِ مشترک" میں نقطہ آغاز اور نقطہ ءانجام کو ساجد خان نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

> "ہاں! میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ شاید اپنے آپ سے بھی زیادہ۔ آج دمِ آخر سوچتی ہوں کاش میں کچھ عرصہ آپ کے ساتھ زندہ رہ سکتی سنیئے آپ اکثر کھانا دیر سے کھاتے ہیں بار بار گرم کرنا پڑتا ہے۔ آپ کھانا وقت پر کھالیا کریں اور ہاں کپڑے بھی بدلا کریں"(50)

افسانہ نگار نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جس میں انہوں نے ایک عورت کی والہانہ محبت اور الفت جذبات اور احساسات کو اسی کی زبانی پیش کیا ہے۔ مگر اس عورت کا دنیا سے چلے جانے سے مرد کچھ دن سوگ مناتا ہے مگر رفتہ رفتہ مصروفیت اور تنہائی کی وجہ سے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ مگر آخر میں افسانہ نگار ہمیں اس فرد کی حقیقت سے ہمیں یوں روشناس کراتے ہیں:

> "کچھ دنوں بعد ایک دلکش چہرے، موٹی سیاہ آنکھوں والی، زندہ رہنے کی امنگ سے بھرپور، خوبصورت جسم کی مالکہ اس کے پلنگ پر انتظام کر رہی تھی۔ جنس مخالف سے محبت اور اس کی غیر مرئی کشش نے دونوں کو ازدواجی بندھن میں جو باندھ دیا تھا۔"(51)

ساجد خان کے تمام افسانے آغاز اور انجام میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جس طرح ابتدا کرتے ہیں اور قارئین کو حیرت و استعجاب ڈال کر اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، اسی طرح اختتام پر وہ غور و فکر کر نے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک بہترین مثال افسانہ "انقلاب" ہے۔ جس کی ابتدا میں افسانہ نگار لکھتے ہیں:

> "پیشے کے لحاظ سے وہ ایک معلمہ تھی لیکن تعلیم نے اس کا بال بھی بیکا نہ کیا تھا۔ کالج جاتی تو لڑکوں کی ٹولیاں اُسے گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک چھوڑنے آتیں۔ شروع شروع میں لوگ دبے لفظوں میں اس کا ذکر کرتے لیکن اب کھلے عام اس کی ذات پر بحث کرنے لگے تھے۔"(52)

افسانہ نگار نے افسانے کی ابتدا میں جس تعلیم یافتہ عورت کا ذکر کیا ہے اور اس کے کردار و رفتار پر جو تذکرہ کیا ہے واقعی قابلِ غور ہے۔ ایسی عورت جو محض کسی عہدے اور منصب کے لیے اپنی عصمت نیلام کر رہی اور بظاہر سادہ اور معصوم دیکھائی دیتی ہے۔ مگر اس کی حقیقت افسانے کے اختتام پر ساجد یوں بیان کرتے ہیں:

> "میں نے اپنے دوست سے پوچھا کیسا انقلاب ؟ اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے نجانے کیا کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہ پایا۔
>
> چند روز بعد اخبار کے صفحہ اول پر تین کالمی شہ سرخی لگی ہوئی تھی۔
>
> شازیہ ثاقب اور مقامی ایم این اے گلفراز ہوٹل سے رنگے ہاتھوں گرفتار۔"(53)

مصنف نے افسانوں میں بے شمار بکھرے مسائل اور انسانی حالات و واقعات اور ان کے جذبات کی ترجمانی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ وہ عوام کے شعور کو جگانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ افسانے کی ابتدا اور انتہا میں معاشرے میں ایک عام فرد کی حیثیت سے عوام الناس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے فلسفیانہ ذہن کے کہانی تحریر کی ہے۔ کیونکہ افسانہ نگار کو مختلف مسائل نے اپنے حصار میں گھیر رکھا ہے۔ وہ افسانوں کے ذریعے ان کی سوچ کو قلم کے ذریعے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساجد خان واقعات کی گہرائی میں اتر کر قارئین کو اس کی اصلیت سے رشناس کرتے جاتے ہیں۔

الغرض ساجد خان نے ادبی دنیا میں ہزارہ کی سرزمین میں رہتے ہوئے بہترین افسانے تحریر کیے جو معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ سادگی، سلامت اور سنجیدگی کی سچی تصویریں ان کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ انہوں نے انسانی معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے افسانوں میں رنگ بھریں ہیں۔ یہی کردار اپنی خوبی اور خامی کی وجہ سے فطری رنگے میں رنگ ہوئے ہیں۔

ساجد خان نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے کہانی میں اختصار کے ساتھ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے بے جا طوالت سے پرہیز کیا ہے۔ ان کا ذہن فلسفیانہ ہونے کے ساتھ ساتھ انداز بیگن خطیبانہ اور اسلوب بیان جدت و ندرت کا حامل ہے۔ ان کی تحریروں میں ابتدا تا انتہا واقعات آپس میں اس قدر پیوسط ہیں۔ کہ کسی ایک واقعے کو خذف کرنے سے افسانوی رنگ بے ڈھنگ ہو جاتا ہو جاتا ہے۔ وہ عوام کو جو واعظ و نصیحت کرتے ہیں اس سے عوام الناس شعور وادراک اور انصاف حاصل کرنے کے لیے قائل ہو جاتی ہے۔ بِلا شبہ وہ سلجھے ہوئے ذہن سے افسانوں میں نئے ایسے الفاظ اور جملوں کو استعمال کرتے ہیں جو سنتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں اور افسانوی ماحول کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا منفرد اسلوب بیان ہے، وہ سادگی و سلامت سے اپنا مقصد بیان کرتے ہیں۔

ساجد خان کے افسانوں کی سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ وہ کہانی لکھنے کے فن کو خوب جانتے ہیں۔ افسانے کی ابتدا ہی میں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور جس بناء پر قاری کس قسم کی بوریت محسوس نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ قاری افسانے کے آخر تک تجسس میں مبتلا رہتا ہے۔ اور افسانہ نگار اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں ساجد خان کا نام سرِ فہرست رہے گا۔

حوالہ جات

1. ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، 2018، ص136
2. بشیر رانجھا، ساجد خان کا فکر و فن، سلطان پبلشرز، راولپنڈی، 2019، ص28
3. احمد فراز، درد آشوب، خالد اکیڈمی، پبلشرز، راولپنڈی، س ن، ص22
4. ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ایضاً، ص28
5. محمد بشیر رانجھا، ساجد خان کا فکر و فن، ایضاً، ص31
6. ساجد خان، دائرے کا اسیر، سکائی پرنٹرز، فرنڈز پبلشرز، 2011، ص12
7. ایضاً، ص38
8. ایضاً، ص39
9. ایضاً
10. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، سلطان پبلشرز، راولپنڈی، 2014، ص28
11. ایضاً

12. ایضاً، ص72

13. ایضاً، ص96

14. رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2018، ص31

15. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص22

16. سید وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، الوقار پبلشر ز لاہور، 2014، ص110

17. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص61

18. ایضاً، ص48

19. ایضاً، ص59

20. ایضاً، ص82

21. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص93

22. ایضاً، ص20

23. وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، ایضاً، ص61

24. ایضاً، ص20

25. وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، ایضاً، ص61

26. انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، 2019، ص44

27. سید وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، 2014، ص122

28. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص15

29. ایضاً، ص11

30. ایضاً، ص29

31. ایضاً، ص46

32. ایضاً، ص88

33. ایضاً، ص53

34. ایضاً، ص59

35. ایضاً، ص28

36. ایضاً، دیباچہ، ص7

37. انور جمال، ادبی اصطلاحات، ایضاً، ص47

38. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص92

39. ایضاً، ص46

40. ایضاً، ص20

41. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، ص10

42. ایضاً، ص33

43. ایضاً، ص71

44. ایضاً، ص17

45. وقار عظیم، نیا افسانہ، مطبوعہ، جناح پریس، دہلی، س ن، ص152

46. رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، ایضاً، ص87

47. ڈاکٹر سفیان سفی، جدید افسانہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2012، ص71

48. ساجد خان، دائرے کا اسیر، ایضاً، 42

49. ایضاً، ص28

50. ایضاً، ص72

51. ایضاً، ص35

52. ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ایضاً، ص15

53. ایضاً، ص16

باب چہارم:

محاکمہ

اردو فن وادب کی تعمیر وترقی میں بیشتر شعراءوادباء نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ سماج میں رونما ہونے والے معاشی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کو موضوع سخن بنا کر مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ یہ اصناف شاعری کی ہوں یا نثر کی، مگر مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا اور عوام الناس میں فکر وشعور کی نئی راہیں متعین کیں۔

اردو زبان کی ابتدا میں اگرچہ شاعری کے مضامین عشقیہ اور سادہ تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ان مضامین میں وسعت آئی اور شاعری جیسی صنف ہر عام وخاص مین مقبول ہوئی۔ بعینہ نثر کی حالت بھی شاعری ہی کی طرح افسانوی ادب سے ہوئی۔ جس کا انسان اور انسانی سماج سے کوئی تعلق وربط نہیں تھا۔ فمافوق الفطرت عناصر اور دیگر ایسی من گھڑت کہانیاں تخلیق ہوئیں۔ جن کے باعث نئے لکھنے والوں کے لیے نئے مواقع میسر ہوئے۔ ان نئے لکھنے والوں نے افسانوی ادب کو زندگی اور سماج کے قریب لا کھڑا کر دیا۔ داستانوں کے بجائے ناول نگاری کی طرف توجہ دی گئی اور زندگی کے سچے اور حقائق حالات وواقعات کو بیان کیا گیا۔ داستان چونکہ طویل اور من گھڑت کہانی پر مشتمل تھی۔ جب کہ ناول، داستان کے مقابلے میں مختصر اور حقیقت نگاری کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اب داستانوں کے بجائے ناول نگاری کی ضرورت واہمیت پر زور دیا گیا اور ناول نگاروں نے شاہکار ناول تخلیق کیے۔

داستان ہو یا ناول کی ان تخلیقات نے اردو زبان وادب کی ساکھ بحال کی اور زبان وادب کے فروغ کے لیے ہزاروں تصانیف متعارف کیں۔ انیسویں صدی اردو نثر اور شاعری کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس صدی میں شاعری کی مختلف اصناف اور نثر میں افسانوی ادب کو بقائے دوام ملا۔

بیسویں صدی میں شعراء وادباء نے نہ صرف روایتی انداز اپنایا بلکہ نت نئی اصناف اور مضامین بھی منظر عام پر آئے۔ یہ صدی خصوصاً جدیدیت کے نام سے اہم ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں نے ناول نگاری کی روایت کو چھوڑ کر افسانہ نگاری جیسی صنف کو متعارف کروایا۔

ناول نگاری کے بجائے افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کی گئی کیونکہ ناول کے مقابلے میں افسانہ مختصر کہانی ہوتی ہے اور زندگی کے کسی ایک رُخ کی عکاسی کرتی ہے۔ جب کہ ناول میں زندگی سے جڑے تمام حالات وواقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ اسی لیے قارئین نے ناول نگاری کے بجائے افسانہ نگاری کو اہمیت دی اور اس کے مطالعے کو ذوق وشوق سے پروان چڑھایا۔

افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ترقی پسند تحریک کے زیرِ اہتمام ہوا۔ مختلف محققین نے افسانہ نگاری کے آغاز وارتقاء میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ بعض ناقدین منشی پریم چند کو پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔ کچھ محققین سجاد حیدر یلدرم کو اور بعض کرشن چندر کو افسانہ نگاری کا مؤجد جانتے ہیں۔ افسانے کا ابتدائی دور 1930ء سے حقیقت پسندی اور رومانیت کی لہروں کے سپرد بہتا رہا۔ مگر جلد ہی افسانہ انقلابی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوا۔ دوسری عالمی جنگ کے مسائل نے ہر فرد کو پریشان ومضطرب کر رکھا تھا۔ جس کے باعث افسانہ نگاری کو رومانیت کے بجائے حقیقت پسندی سے روشناس کیا۔ اسی دور کے لکھنے والوں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند اور قراۃ العین حیدر کے نام نمایاں ہیں۔

1970ء کا دور اردو افسانہ کا اہم دور رہا۔ کیونکہ اس دور میں لکھنے والوں نے گزشتہ سات دہائیوں کے تجربات اور تخلیقات سے استفادہ کر کے اس کو نئی سمت عطا کی۔ اس طرح اس افسانے میں کہانی پن تو موجود رہی مگر علامت نگاری کو اس کا حصہ بنایا گیا۔ اس دور کے لکھنے والوں میں مرزا حامد بیگ،

عبد الصمد، سائرہ ہاشمی، ابن کنول، عرش صدیقی، مجید عارف اور کامران حسین کاظمی کے نام سر فہرست ہیں۔ جنھوں نے نئی علامتوں سے کام لیا اور یہ علامتیں غیر واضح تھیں مگر افسانے کی روایت کو بر قرار رکھتے ہوئے ان افسانہ نگاروں نے نئی علامتوں کو وضع کیا۔

عصرِ حاضر میں افسانہ نگاروں نے افسانے کی زبان وبیان اور علامت نگاری کو واضح اور صاف انداز میں پیش کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قدیم افسانہ اور جدید افسانہ نگاری نے اردو افسانوی ادب کو پروان چڑھایا اور نئے لکھنے والوں نے نئے انداز کے موضوعات کو موضوع بنایا۔

اردو افسانہ نگاری کو ہزارہ کی سر سبز وشاداب سرزمین نے زرخیزی بخشی۔ اسی سلسلے میں ہزارہ کے نمائندہ فنکاروں نے مختصر کہانی کو روایتی انداز میں آگے بڑھایا بلکہ ساتھ ساتھ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے بہت نئے مضامین دریافت کیے۔ ہزارہ کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے ساجد خان کا شمار اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے روایتی انداز کو اپناتے ہوئے معاشی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کو جزئیات نگاری سے تخلیق کیا۔ ان کی تحریریں گوناگون فکری وفنی صلاحیتوں سے مزین ہیں۔ ان کی مختصر کہانی فکری جہتوں سے بھرپور ہے۔

ساجد خان کے افسانے سماجی ومعاشی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے ہر طرح کے موضوعات کو اپنی گرفت میں لے کر متعدد افسانے تخلیق کیے۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرنے سے نہ صرف دورِ حاضر کے مسائل سے بخوبی آگاہی ملتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ یہ افسانے فنی پختگی کا بین ثبوت بھی ہے۔

ان کے افسانوں میں موضوعات کی جدت ہے۔ اگرچہ روایتی مضامین کو بھی انہوں نے بڑی مہارت سے باندھا ہے۔ مگر ان موضوعات کو وہ اس طرح ادبی رنگ دیتے ہیں کہ جو عام ہونے کے

باوجود بھی نئے معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی سے جڑے ہر مسئلے اور بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کو انسان بہت کم ہی اہمیت دیتا ہے اور پاؤں تلے روندھ جاتا ہے۔ مگر انہوں نے ان موضوعات کو اس سلیقے سے برتا ہے کہ قارئین پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ساجد خان کے افسانوں میں فکری رجحانات کی رنگارنگی ہے۔ بیان کرنے کا انداز بے تکلفانہ ہے۔ ان کی کہانیاں کسی ایک انسان یا کسی ایک معاشرے کے لیے نہیں ہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کے لیے ایک اہم پیغام اور تحفہ ہیں۔

ساجد خان کے افسانوں میں جذباتی پہلو، معاشی مسائل، رومانیت، نفسیاتی پہلو، سماجی مسائل، تانیثیت، سیاسی پہلو اور ادبی پہلو ایسے اہم اور چیدہ چیدہ فکری عناصر ہیں جن کا تذکرہ گزشتہ باب میں کر دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ان کے افسانوں میں دیگر ایسے موضوعات بھی ہیں جو دورِ حاضر کے تقاضوں پر پورا اترتے ہیں۔ سماج اور معاشرے سے جڑے حالات وواقعات کا وسعتِ نظری سے مطالعہ کرتے ہیں اور بغیر کسی لگی لپٹی کے تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی انفرادیت اسی وجہ سے برقرار ہے کہ وہ موضوعات کو اسی حقیقت سے بیان کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں جس طرح وہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کے عام فرد سے لے کر خاص فرد، جاندار، بے جان، پرندے اور دیگر اشیا کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور عوام میں عصری شعور چاہنے کی ہر ممکن کوشش کے قائل نظر آتے ہیں۔

ساجد خان کے افسانے جہاں فکری عناصر کی عکاسی کرتے ہیں وہاں فنی خصوصیات بھی نمایاں ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے تمام حالات وواقعات، مسائل، عدم مساوات اور دیگر حوادث کو اس طرح فن کے قالب میں ڈھالتے ہیں کہ معاشرے کا ہر فرد ان سے مسرت تو حاصل کرتا ہی ہے مگر ان مسائل

کے حل کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرتا ہے۔ افسانہ نگار اپنی کہانی کو مکمل طور پر فنی پہلوؤں سے آگے بڑھاتے ہیں اور ان سے متعلق تمام لوازمات کو عمدگی سے استعمال کرتے ہیں۔ مصنف کا فن نہایت سادہ اور شگفتہ ہے۔ ان کے افسانوں میں اختصار، اسلوب کی سادگی، وحدتِ تاثر، خیال آفرینی یہاں تک کہ ان کی جزئیات نگاری بھی مناسب صورت میں ہے۔ ان کی تحریریں اور اندازِ بیان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ انہوں نے جس اسلوب کو اپنی تحریروں میں بنیادی وجہ بنایا ہے اور جس کے باعث وہ دوسرے ہم عصروں سے منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ سب ان کا منفرد اسلوب ہے۔

ساجد خان کی زبان و بیان میں اثر پایا جاتا ہے۔ وہ الفاظ کا بہترین چناؤ کرتے ہیں اور اپنے افسانوں کو جمالیاتی سطح تک لے آتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ساجد خان کے افسانے گہرے مشاہدات کے بعد واقعات کے جذبات کو پیش کرتے ہیں۔ جس کے سبب ان کی کہانی میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ خطیبانہ انداز بھی واضح نظر آتا ہے۔ وہ ان افسانوں کے ذریعے قارئین کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کرتے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی اور سماج کے مسائل کو وہ فن کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے فنی پہلو جیسے زبان و بیان، پلاٹ، کردار نگاری، نقطہ نظر (وحدتِ تاثر)، مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور پھر اختتام اس انداز سے تخلیق کیے گئے ہیں کہ جس طرح افسانے کو ضرورت ہوتی ہے۔

ساجد خان عصرِ حاضر کے وہ افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے ہر طرح کے فنی پہلوؤں سے بھرپور ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو قارئین پر گہرے اثرات مرتب کرتے جاتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ماحول، معاشرہ اور تہذیب کی عکاسی کرداروں کے ذریعے نئی منفرد انداز میں کرتے ہیں

کہ قارئین خود کو اس کا حصہ قرار دینے لگتے ہیں۔ وہ افسانے کا آغاز جس خوبصورتی سے کرتے ہیں اسی طرح اس کا اختتام بھی نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔

الغرض ساجد خان نے ادبی دنیا میں ہزارہ کی سرزمین میں رہتے ہوئے بہترین افسانے تحریر کیے جو معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ سادگی، سلامت اور سنجیدگی کی سچی تصویریں ان کے افسانوں میں کثرت سے ملتی ہیں۔ انہوں نے انسانی معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے افسانوں میں رنگ بھریں ہیں۔ انہوں نے نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے کہانی میں اختصار کے ساتھ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے بے جا طوالت سے گریز کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ وہ کہانی لکھنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ افسانے کی ابتدا میں ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں جس کے باعث قاری کسی قسم کی بوریت محسوس نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ قاری افسانے کے آخر تک تجسس میں مبتلا رہتا ہے اور کہانی آخر کار اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔

مختصر یہ کہ ساجد خان عصر حاضر کے وہ مایہ ناز افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے ہر طرح کے فکری وفنی پہلوؤں سے مزین ہیں۔ ان کے افسانے نہ صرف کسی فرد یا معاشرے تک محدود نہیں بلکہ پوری عالم انسانیت کے لیے اہم پیغام ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ساجد خان متعارف ہوتا جائے گا۔ اردو زبان وادب میں مقام ومرتبہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی تحریروں میں مزین جدت وندرت میں نمایاں اور سرفہرست رہے گا۔ افسانہ نگاروں کی فہرست میں ساجد خان کی اہمیت مسلمہ ہوگی اور ان کی تحریریں ان کو زندہ جاوید بنا دیں گی۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

ساجد خان، دائرے کا اسیر، سکائی پرنٹرز، فرینڈز پبلشرز، اپریل 2011

ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، سلطان پبلشرز، راولپنڈی، 2014

ثانوی مآخذ:

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام اباد، 2018

انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2019

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی، اردو، پاکستان، 2013

بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اردو زبان وادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ، مرکز تحقیق واشاعت، 2012

پریتا بیتا، اردو ناول کے منفی کردار (آغاز یا قیام پاکستان)، تحقیق و تنقید، خرم بکس اردو بازار لاہور، 2006

حزب اللہ، تحلیل نفسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، 1962

خالد محمود منٹو، بیدی اور ممتاز مفتی کے افسانوں میں ابنارمل کردار، علمی پرنٹنگ پریس لاہور

خاور جمیل، مرتب: ادب، کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی، کراچی، 1982

رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2018

روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول 2012

ریاض احمد، تنقیدی مسائل، اردو بک اسٹال لاہور، 1961

سگمنڈ فرانڈ، خوابوں کی تعبیر، مترجم، امیر خان حکمت، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2016

سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگاری (تنقیدی مطالعہ)، لاہور، 1991ء

محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، سلطان پبلشرز، راولپنڈی، 2019